چند دلچسپ کہانیاں

(بچوں کے لئے)

سیّد اشتیاق الحسن

ایم۔ اے۔ ایم۔ ایڈ، (علیگ)

نیشنل بُک فاؤنڈیشن

اسلام آباد

لاہور ۔ راولپنڈی ۔ ملتان ۔ کراچی ۔ سکھر ۔ پشاور ۔ کوئٹہ

طبع اوّل : ۱۹۸۱ء : دو ہزار
طبع دوم : ۱۹۸۲ء : دو ہزار
کوڈ نمبر : جی بی آر پی / پی ۱۵۸/ ۲۰۰۰
مطبع : پاک پیکیجز۔ ناظم آباد۔ کراچی

فہرست

بہادر دشمن

یہ کہانی اس زمانے کی ہے جب ہندوستان پر مغل بادشاہ اکبر حکومت کرتا تھا۔ اس زمانے میں ایک راجپوت سردار حکومت سے باغی ہو گیا اور جنگلوں میں جا کر چھپ گیا۔ وہاں اس نے بہت سے ساتھی بنا لئے۔ اس کے بعد وہ بادشاہ کی فوج پر چھپ چھپ کر حملے کرنے لگا۔ اس طرح وہ نقصان پہنچا کر بھاگ جاتا تھا۔ شاہی فوج نے اسے گرفتار کرنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر اسے گرفتار کرنے میں کامیاب

نہ ہو سکی۔ شہنشاہ اکبر نے سارے ملک میں یہ اعلان کرا دیا کہ جو شخص اس راجپوت سردار کو زندہ یا مردہ گرفتار کر کے لائے گا، اسے مالا مال کر دیا جائے گا۔

اس راجپوت سردار کی بیوی اور ایک بچّہ بھی تھا جو اس کے گھر پر موجود تھے۔ بادشاہ کے آدمی ہر وقت اس کے گھر کے گرد چکر لگاتے رہتے تھے اس صورت میں اس کے گھر آنے اور اپنی بیوی بچّے سے ملنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ اس کے علاوہ بادشاہ نے اس کے گھر پر سخت پہرہ بھی بٹھا رکھا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ کسی نہ کسی طرح اپنے گھر والوں کی خیریت معلوم کر ہی لیتا تھا۔

ایک دن اس راجپوت سردار کو خبر ملی کہ اس کا اکلوتا بیٹا سخت بیمار ہے۔ اس کے بچنے کی کوئی اُمید نہیں۔ یہ خبر سن کر وہ بے حد

پریشان ہو گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے پیارے بیٹے کو جاکر دیکھنا چاہیئے۔ مگر گھر جانے کا مطلب جان بوجھ کر موت کے منہ میں جانا تھا۔ بہت سوچ بچار کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنے بچّے کو دیکھنے ضرور جائے گا۔ چنانچہ وہ اپنے علاقے کی طرف روانہ ہو گیا۔ جب وہ اپنے گھر پہنچا تو پہرے پر موجود ایک سپاہی نے اسے ٹوکا اور پوچھا: "تم کون ہو اور کس سے ملنے آئے ہو؟"

راجپوت سردار نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا اور سپاہی سے کہا: "میں وہی باغی راجپوت سردار ہوں جس کے لئے تم اس وقت پہرہ دے رہے ہو۔ میں اپنے بچّے کو دیکھنے آیا ہوں جو سخت بیمار ہے۔ تمہیں خدا کا واسطہ، چند لمحوں کے لئے مجھے اپنے لختِ جگر کو دیکھنے کی اجازت دے

دو۔ اس کے بعد تم مجھے شوق سے گرفتار کر لینا۔"

وہ مسلمان سپاہی خدا ترس اور رحم دل انسان تھا۔ اسے اپنا وہ بچّہ یاد آگیا جو سخت بیمار تھا۔ لیکن وہ بچّے کو دیکھنے نہیں جا سکتا تھا، کیونکہ اسے پہرہ کے لیۓ یہاں حاضر رہنا ضروری تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے بیمار بچّے کی صورت آگئی۔ اُس نے سوچا نہ جانے اب میرے بچّے کی حالت کیسی ہو گی۔ اسے کتنی دنوں سے اپنے گھر کی خیریت نہیں ملی تھی۔ راجپوت سردار کو یوں مجبور کھڑا دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ وہ بولا۔" سردار تم نے خدا کا واسطہ دیا ہے۔ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تمہارا بچّہ سخت بیمار ہے۔ جاؤ، اسے دیکھ آؤ۔"

راجپوت سردار سپاہی کا شکریہ ادا کر کے اپنے گھر میں داخل ہو گیا۔ اس نے اپنے بیمار بچّے کو بہت پیار کیا اور اپنی بیوی سے کچھ باتیں کیں، پھر واپس جانے کے لیۓ مڑا۔ بیوی نے کہا:" اب اس راستے سے واپس نہ جاؤ۔ ورنہ گرفتار کر لیۓ

جاؤ گے۔ گھر میں ایک خفیہ راستہ بھی ہے۔ تم اسی راستے سے باہر نکل جاؤ۔"

راجپوت سردار نے کہا: "بہادر انسان اپنے وعدوں سے نہیں پھرا کرتے۔ میں نے سپاہی سے جو وعدہ کیا ہے، اسے ضرور پورا کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ گھر سے باہر آیا اور خود کو سپاہی کے حوالے کرتے ہوئے کہا: "لو بھئی، اب میں حاضر ہوں۔ مجھے گرفتار کر لو۔"

سپاہی نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا! "تمہارے بچّے کی طبیعت اب کیسی ہے؟"

راجپوت سردار نے آہ بھرتے ہوئے جواب دیا: "وہ بہت بیمار ہے اور اب وہ شاید ہی بچے۔" یہ کہتے ہوتے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پھر وہ بولا: "میں تمہارا بے حد شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے میرے بچّے سے ملنے کا موقع دیا۔ میں تمہارے اس احسان کو کبھی نہیں بھولوں گا۔"

سپاہی کو راجپوت سردار پر رحم آگیا۔ وہ بولا:
"تم یہاں سے بھاگ جاؤ۔ میرا دل نہیں چاہتا
کہ میں تمہیں گرفتار کروں اور تمہیں بعد ازاں پھانسی
دے دی جائے گی۔"

راجپوت سردار نے اسے سمجھایا کہ "اے رحم
دل سپاہی! میری گرفتاری سے تمہیں انعام ملے گا
اور اگر تم نے مجھے گرفتار نہ کیا تو تم مصیبت میں
پھنس جاؤ گے۔"

سپاہی نے جواب دیا: "مجھے ایسے انعام کی
ضرورت نہیں۔ سارے جہاں کا مالک اللہ ہے۔
اے سردار! بچانے والا، مارنے والے سے زیادہ
جانتا ہے کہ کس کو کس طرح بچایا جائے۔"

راجپوت سردار اس سپاہی کا شکریہ ادا کرکے
روانہ ہو گیا۔ اس کے گھر آنے کی خبر جنگل کی
آگ کی طرح پھیل گئی۔ بادشاہ کی فوج کا ایک
جرنیل اس کی تلاش میں اس کے گھر آیا اور سپاہی

سے راجپوت سردار کے بارے میں دریافت کیا۔ پہلے تو سپاہی نے ٹال مٹول سے کام لیا۔ مگر جب جرنیل نے سختی سے پوچھا تو اس نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔ اس جرنیل کو سپاہی کی اس کارروائی پر سخت غصّہ آیا۔ اس نے اسی وقت اسے بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لیا اور شہنشاہ اکبر کے سامنے پیش کرنے کے لئے روانہ ہوا۔ راجپوت سردار ابھی اس علاقے سے زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ اسے بھی یہ خبر مل گئی کہ اس کے محسن و مہربان سپاہی کو محض اس الزام میں گرفتار کر لیا گیا ہے کہ اس نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ پہلے تو اس سردار کے دل میں یہ خیال آیا کہ بھاگ جائے، مگر دوسرے ہی لمحے اس نے سوچا کہ کسی کے احسان کو بھلا دینا بہت ہی بڑا پاپ ہے۔ یہ سوچ کر اس نے اپنے گھوڑے کو تیز بھگایا اور آناً فاناً شاہی فوج

کے اس جرنیل کو جا لیا جو اس سپاہی کو گرفتار
کر کے لے جا رہا تھا جس نے اسے چھوڑ دیا
تھا۔

اس راجپوت سردار نے جرنیل کے سامنے پہنچ
کر بڑی دلیری سے کہا: "اے جرنیل! مجرم اور
قصور دار میں ہوں۔ اس سپاہی کا کوئی قصور نہیں۔
اس لیئے مجھے گرفتار کر لو اور اس بے قصور سپاہی کو
رہا کر دو۔ اس نے محض انسانی ہمدردی کے تحت
مجھے چھوڑ دیا تھا۔ اس غریب کو اس کی رحم دلی
اور نیکی کی سزا کیوں دیتے ہو؟"

جرنیل راجپوت سردار کو اپنے سامنے دیکھ کر
دم بخود رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی یہ
بات نہ تھی کہ وہ جسے گرفتار کرنے کے لیئے حیران و
پریشان ہے اور شاہی فوج جس کی تلاش میں ایک
عرصہ سے سرگرداں ہے، اس وقت وہ خود بخود اس
کے سامنے آ کھڑا ہو جائے گا اور اپنے آپ کو

گرفتاری کے لئے پیش کرے گا۔ جرنیل نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور اسے فوراً گرفتار کر لیا۔

مغل شہنشاہ جہانگیر کا انصاف مشہور زمانہ ہے، مگر اس کا باپ اکبر بھی کوئی کم انصاف پسند نہیں تھا۔

باغی سردار اور سپاہی کو اکبر کے دربار میں پیش کیا گیا۔ آج ان دونوں کی قسمت کے فیصلے کا دن تھا۔ درباریوں کو اور دربار کے باہر کھڑے ہوئے لوگوں کے ہجوم کو اکبر بادشاہ کے فیصلے کا بڑی بے تابی سے انتظار تھا۔

بادشاہ نے ان دونوں کی باتیں سننے کے بعد یہ فیصلہ سنایا: "اے سپاہی! یہ ٹھیک ہے کہ تم نے اپنا فرض ادا نہیں کیا۔ مگر مجھے اس کی بے حد خوشی ہے کہ میری فوج میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو مجھ سے زیادہ اپنے مالکِ حقیقی یعنی خدا سے ڈرتے ہیں۔ تمہاری

اس جرأت مندانہ رحم دلی اور خدا ترسی نے میرے دل پر بہت اثر کیا ہے۔ بہر حال، انسان کو پہلے انسان اور بعد میں کچھ اور ہونا چاہیئے۔ وہ انسان، انسان نہیں جس کا دل دوسرے کی تکلیف اور مصیبت دیکھ کر بھر نہ آئے۔میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔ جاؤ، تم پہلے اپنے بیمار بچے کو دیکھ آؤ، اس کے بعد اپنی نوکری پر دوبارہ جا سکتے ہو۔"

اس کے بعد بادشاہ نے راجپوت سردار سے کہا :

"بہادر سردار! میں تمہاری بہادری اور ایمانداری کو دیکھ کر بہت متاثر ہوا ہوں۔ تم نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے وعدے کو نبھایا۔ تمہاری یہ خوبی قابلِ قدر ہے۔ اگر تم چاہتے تو آسانی سے فرار ہو سکتے تھے۔ مگر تم نے احسان فراموشی کو پسند نہیں کیا۔ اگرچہ تم ہمارے دشمن ہو اور ہماری حکومت کے باغی بھی، مگر میں ایسے

باضمیر دشمن اور باغی کا قدر داں ہوں۔ تم اگر اب بھی میری مخالفت کرنا چاہتے ہو اور مجھ سے بغاوت پر آمادہ ہو تو، جاؤ ضرور ایسا کرو۔ بہر حال میری فوج کے دلاور سپاہی تمہیں کسی اور موقع پر ضرور پکڑ لیں گے۔ جاؤ، اس وقت تمہیں معاف اور آزاد کیا جاتا ہے۔" اکبر کا یہ فیصلہ سُن کر تمام درباری دنگ رہ گئے۔ راجپوت سردار بھی یہ فیصلہ سن کر حیرت زدہ ہو گیا اور کچھ دیر تک اس طرح گم سُم کھڑا رہا، جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔ پھر وہ شہنشاہ اکبر کے سامنے ادب سے جھکا اور گویا ہوا:

"شہنشاہِ عالم پناہ! میں غلطی پر تھا۔ میں اپنی اس نادانی پر سخت شرمندہ ہوں۔ آپ جیسے خدا ترس اور نیک بادشاہ کے لئے تو میری جان بھی حاضر ہے۔ آج سے میں آپ کا وفادار خادم ہوں۔ اور اب میں آپ اور

سلطنتِ مغلیہ کی سچے دل سے خدمت کرنا
چاہتا ہوں۔" ان الفاظ کو ادا کرتے وقت
راجپوت سردار کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے
تھے مگر یہ آنسو خوشی اور احسان مندی کے
آنسو تھے!!!

پھوٹ کا انجام

صدیوں پرانی بات ہے کہ کسی جنگل میں ایک بڑا تالاب تھا۔ اس تالاب کے کنارے املی کا ایک بہت ہی پرانا درخت تھا جس پر ایک چیل رہتی تھی۔ یہ چیل بہت ہی ہوشیار اور چالاک تھی۔ اسی درخت کے نیچے ایک چوہا اپنے بل میں آرام اور سکون کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ چوہا بڑا ہی جیالا تھا۔ وہ کبھی کبھی مستی میں آکر اپنے بل سے باہر نکلتا اور اِدھر اُدھر گھوم پھر کر اپنے بل میں چلا جاتا۔

اس تالاب میں ایک بڑا سا مینڈک بھی رہا کرتا تھا۔ وہ پانی سے کبھی باہر نہ آتا۔ وہ جب موج میں آتا تو خوب ٹرٹر کر کے راگ الاپا کرتا تھا۔

چیل مدت سے ان دونوں کی تاک میں لگی تھی۔ مگر نہ تو چوہا ہی اس کے ہتھے چڑھتا تھا اور نہ مینڈک اس کے ہاتھ لگتا۔

ایک دن چوہا اپنے بل میں آرام کر رہا تھا کہ چیل اس کے بل کے قریب آئی اور بولی: "پیارے دوست! آپ کے مزاج کیسے ہیں؟" گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے چیل نے کہا: "اے بھائی! میں بڑی پریشان رہتی ہوں۔ اسی پریشانی کو دور کرنے آپ کے پاس آئی ہوں۔ آپ میرے پڑوسی ہیں اور میری پریشانی کو بڑی آسانی سے دور کر سکتے ہیں۔"

چوہے نے جواب دیا: "بندہ کس لائق ہے۔

پھر بھی اگر میں آپ کے کسی کام آ سکا تو یہ میری خوش قسمتی ہو گی۔ فرمایئے، کیا حکم ہے؟"

"کیا عرض کروں، بھائی صاحب!" چیل نے کہا اور بات جاری رکھی: "پڑوس میں رہنے کے کچھ آداب اور طریقے ہوتے ہیں۔ آپ ایک خاندانی اور شریف چوہے ہیں، اور آپ کس قدر شرافت سے رہتے ہیں۔ ایک یہ کم بخت بے ہودہ مینڈک ہے۔ نہ جانے کس نیچ خاندان سے تعلق رکھتا ہے کہ دن رات میراثیوں کی طرح ٹرٹر کا راگ الاپتا رہتا ہے۔ آخر ٹرٹر کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ نہ دن دیکھتا ہے نہ رات۔ میری تو اس نے نیند حرام کر رکھی ہے۔ میرا خیال ہے، آپ بھی سکون سے رہنا پسند کرتے ہیں۔ آپ کو بھی یہ شور اچھا نہ لگتا ہو گا۔ آپ اپنی شرافت کی وجہ سے خاموش رہتے ہیں اور اس کمینے

سے کچھ نہیں کہتے۔ وہ آپ کی شرافت کو آپ
کی کمزوری سمجھتا ہے۔ اسے ہم لوگوں کی ذرّہ
برابر بھی پروا نہیں ہے۔ میرا نہ سہی، کم از کم
آپ کا تو اسے خیال رکھنا چاہیے۔"

چوہا اپنی تعریف سُن کر پھولا نہ سمایا اور بولا:
"محترمہ بہن صاحبہ! اس بدبخت کی دن رات
کی ٹر ٹر سے میں بھی عاجز آچکا ہوں، مگر میری
سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس طرح روکوں۔
آپ ہی کوئی ترکیب بتاییے۔ آپ ماشاء اللہ
کافی تجربہ کار اور عقل مند معلوم ہوتی ہیں۔"

"ایک نہایت آسان اور عمدہ ترکیب ہے۔ اگر
ہم اس ترکیب پر عمل کریں تو اس مصیبت سے
بڑی آسانی سے چھٹکارا پا سکتے ہیں۔" چیل
دل ہی دل میں مُسکراتے ہوئے بولی:

"آپ مجھے یہ ترکیب بتایئں۔ ہم اور آپ
پڑوسی ہیں ہم پر ایک دوسرے کا حق ہے۔" چوہے

نے کہا۔" جنابِ من ! میرا خیال تو یہ ہے کہ یہ منحوس جب بھی ٹر ٹر کرنا شروع کرے، آپ کنارے پر سے کنکریاں اٹھا اٹھا کر اسے مارنا شروع کریں۔ یہ کم بخت اس سے ڈر کر خود ہی خاموش ہو جائے گا اور آئندہ ایسی منحوس آوازیں نکالنے سے باز رہے گا۔" چیل نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

چوہا یہ ترکیب سُن کر بے حد خوش ہوا۔ اس نے کہا: "بے فکر رہیئے بہن۔ میں اس کی ایسی پٹائی کروں گا کہ وہ یہ بے وقت کا راگ الاپنا بالکل بند کر دے گا۔ اب آپ اطمینان رکھیں اور میرا کمال دیکھیں۔"

چوہے کو اپنی بڑائی جتانے کا ایک موقع ہاتھ آگیا، اس لئے وہ کسی طرح بھی اسے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد چیل تالاب کے اس

کنارے پر گئی جہاں مینڈک رہا کرتا تھا اور اس سے بولی: "قبلہ مینڈک صاحب! رات کے وقت آپ خوب گاتے ہیں۔ آپ کی آواز اتنی سریلی اور روح پرور ہوتی ہے کہ طبیعت مسرور ہو جاتی ہے۔ میرے پاس اس کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ آپ کی آواز کے زیروبم اور گانے کے انداز سے یہ صاف پتہ چلتا ہے کہ آپ ایسے ویسے نہیں ہیں، بلکہ ایک خاندانی اور باذوق گویے ہیں۔ مجھے یہ یقین ہے کہ آپ کا تعلق کسی نہ کسی پشت میں ضرور تان سین سے رہا ہو گا۔ واللہ! آپ کیسے کیسے دلکش اور خوبصورت سُر نکالتے ہیں۔ آپ کی آواز سن کر بس یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے کانوں میں شہد ٹپک رہا ہے۔ آپ میرے پڑوس میں رہتے ہیں۔ میرا بھی آپ پر کچھ حق ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ آج رات کو آپ دو چار راگ زیادہ سنائیے گا، کیونکہ

آج رات میرے بچّے کی سالگرہ کی تقریب ہے۔ میرا بچّہ آپ ہی کا بچّہ ہے۔ آج آپ بھی ہماری خوشی میں شریک ہوں۔ میرے بچّے نے ضد کر کے آپ کے پاس مجھے بھیجا ہے کہ ماموں جان سے گانے کی فرمائش کروں۔ سو میں آپ کے پاس چلی آئی ہوں۔"

مینڈک اپنی تعریف سن کر پھولا نہ سمایا اور بولا:

"بہن چیل صاحبہ! آپ مجھے کیوں شرمندہ کرتی ہیں۔ مجھے گانا وانا کہاں آتا ہے۔ بس یونہی وقت کاٹنے کی غرض سے اور اپنے شوق کی خاطر تھوڑا بہت گا لیتا ہوں۔ ویسے میں نے گانا گانے کی جس قدر مشق کی ہے، اتنی کسی نے آج تک نہیں کی ہو گی۔ اب میں آپ کا دل کس طرح توڑوں۔ آپ اطمینان رکھیں اور میرے پیارے بھانجے سے جا کر کہہ دیں کہ اس کا ماموں آج اپنے فن کا کمال دکھانے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔"

رات کی سیاہی ابھی پوری طرح پھیل بھی نہ پائی تھی کہ مینڈک نے اپنا بے سُرا راگ الاپنا شروع کر دیا۔ اُسکی ٹَرٹَر سنتے ہی چوہا جو پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا اپنے بل سے فوراً باہر نکل آیا اور کنکریاں اٹھا اٹھا کر مینڈک کو مارنے لگا۔

پہلے تو مینڈک کی سمجھ میں کچھ نہ آیا اور وہ بڑی شان سے ٹرٹر کرتا رہا۔ مگر جب دو چار کنکریاں اس کے اوپر گریں تو اسے احساس ہوا کہ اس کے ساتھ کوئی شرارت کر رہا ہے۔ اس نے زور سے پوچھا: " یہ کون احمق ہے جو اس وقت میرے رنگ میں بھنگ ڈال رہا ہے؟" چوہا غصّے سے بولا: "احمق تو کس کو کہہ رہا ہے؟ میں ہوں چوہا! ارے بیوقوف! خشکی کا شہزادہ۔ تو یہ شور وغل بند کر دے اور مجھے سونے دے۔ تونے ٹرٹر کر کے میری نیند خراب کر دی ہے۔ تو اگر اسی طرح مجھے پریشان کرتا رہا تو میں بھی تجھے ستاؤں گا۔"

مینڈک نے جھلا کر جواب دیا: ”او بد مذاق! تو میرے اس پرسُوز گانے کو شوروغل کہتا ہے۔ تیری یہ مجال۔ کیا تو نہیں جانتا کہ میں کون ہوں اور کیا کر سکتا ہوں؟“

چوہے نے کہا: ”ارے او پانی کے ذلیل جانور! ذرا تمیز سے بات کر۔ کیا تو نہیں جانتا کہ تو کس سے بات کر رہا ہے؟ یہ ہمارے سونے کا وقت ہے۔ ہم اپنی نیند میں خلل برداشت نہیں کر سکتے۔ بند کر یہ ٹر ٹر ورنہ ہم ......“

مینڈک آپے سے باہر ہوتے ہوئے بولا: ”ورنہ ...... ورنہ تو ہمارا کیا بگاڑ لے گا؟ ذلیل چھچھوندر! تو کب سے خشکی کا شہزادہ بن بیٹھا ہے؟ اپنے منہ میاں مٹھو بنتا ہے۔ ہم اس تالاب کے واحد مالک ہیں۔ او اے حقیر چوہے! ہم تجھے حکم دیتے ہیں کہ ابھی اور اسی وقت ہماری سلطنت کی حدود سے باہر نکل جا۔“

چوہا تاؤ میں آکر بولا: "چپ رہ گھونگے کے بچے! تیری یہ مجال کہ تو ہمیں باہر نکل جانے کا حکم دے۔ ذرا پانی سے باہر تو نکل، ہم ابھی تیری ٹانگیں پکڑ کر توڑ دیتے ہیں۔ بڑا آیا تالاب کا مالک!"

بس پھر کیا تھا، مینڈک غصّے میں پیچ و تاب کھاتا ہوا تالاب کے کنارے پر آگیا اور لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا۔ دوسری جانب چوہا بھی پینترے بدلنے لگا۔ کافی دیر تک دونوں میں تُو تُو میں میں ہوتی رہی۔ آخر میں دونوں نے درخت پر بیٹھی ہوئی چیل سے کہا: "اے آسمان کی شہزادی! اب آپ ہی اس بات کا فیصلہ کریں کہ اس تالاب کا اصل مالک کون ہے؟"

چالاک چیل نے بڑے اطمینان سے جواب دیا: "بھائیو! جب تک یہ بات معلوم نہ ہو کہ آپ دونوں میں زیادہ طاقتور کون ہے، میں کس طرح اس کا فیصلہ کر سکتی ہوں۔ ساری دنیا طاقت ور

کو بڑا مانتی ہے۔ اگر تم یں دَم ہے تو میدان
یں آجاؤ۔ اگر کوئی اپنے آپ کو کمزور سمجھتا ہے اور
لڑنے کے قابل نہیں سمجھتا تو اس کے لئے بہتر
یہی ہے کہ وہ چپ چاپ یہاں سے کھسک جائے۔
ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ ابھی اور اسی وقت طاقت
کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ ویسے اس جھگڑے کو
آج اور اسی وقت نپٹا دیا جائے تو بہتر رہے
گا۔ روز روز کی یہ مصیبت ختم ہو جائے
گی اور یہ بھی پتہ چل جائے گا کہ اس تالاب
کا اصل مالک کون ہے۔"

یہ دونوں بے وقوف، چیل کے بھڑکانے پر،
جوش یں آ گئے اور اپنی اپنی طاقت کا لوہا منوانے
کے لئے ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ کافی دیر
تک دونوں یں لڑائی ہوتی رہی، یہاں تک کہ
لڑتے لڑتے وہ دونوں بے دم ہو گئے۔
چیل تو ایسے موقع کی تاک یں تھی ہی۔ اس نے جب

یہ دیکھا کہ دونوں لڑتے لڑتے نڈھال ہو گئے ہیں تو اس نے ایک جھپٹے میں دونوں کو بڑی آسانی سے اپنا شکار بنا لیا۔ اور ان نادانوں کو اس بات کا بھی موقع نہیں دیا کہ کم از کم وہ اپنی حماقت پر شرمندہ ہی ہو سکیں۔

تم کیا جانو

ارشد میاں ہر چیز میں کچھ نہ کچھ نیا پن دکھانا ضروری سمجھتے تھے۔ دکھاوا، بناوٹ اور ظاہری آن بان کو انہوں نے اصل زندگی سمجھ لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اسی میں بڑائی ہے۔ جب وہ گاؤں جاتے تو خاص طور پر وہ وہاں کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور کرتے۔ گاؤں والے حیرت سے دیکھتے اور پوچھتے تو بڑے فخریہ انداز سے کہتے: "واہ! تم کیا جانو، تم لوگ تو دیہاتی ہو۔ شہروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔"

بے چارے گاؤں کے سیدھے سادے لوگ خاموش ہو جاتے۔ وہ سمجھتے، ہو سکتا ہے شہروں میں ایسا ہی

ہوتا ہو۔ بڑے لوگوں اور پڑھے لکھے لوگوں کی بہی باتیں ہوتی ہوں گی۔

گاؤں میں ارشد میاں کو اگر کوئی جامن کھلاتا تو وہ بڑے اطمینان سے پہلے چاقو سے ان کی چھوٹی چھوٹی قاشیں کاٹتے اور پھر انہیں کھاتے۔ اسی طرح ککڑی اور امرود بھی عجیب انداز سے کھاتے۔ کھانا کھانے بیٹھتے تو پھلکوں کے چھلکے اتار کر کھاتے۔ گاؤں والے یہ سب دیکھ کر اگر حیرت سے پوچھ لیتے کہ ارشد بھیّا یہ مریضوں کی طرح کھانا کیوں کھاتے ہو تو وہ ہنستے ہوئے جواب دیتے۔ "واہ! تم کیا جانو، ہمارے یہاں تو یہی ہوتا ہے۔"

اس دفعہ گاؤں جانے سے پہلے ارشد میاں پھر نئی ترکیبیں سوچنے لگے کہ کس طرح گاؤں والوں پر رعب جمائیں اور اپنے شہری ہونے کا بڑا پن ان پر ظاہر کریں۔ جاڑوں کے دن تھے اور وہ بھی جنوری فروری کے کڑاکے کی سردی کے دن۔ ارشد میاں صبح سویرے

گاؤں پہنچے۔ گاؤں والے دکھاوے کی ان کی عزت کرتے تھے۔ مگر حقیقت میں ان کے گھمنڈ کی وجہ سے وہ انہیں ناپسند کرتے تھے۔ گاؤں میں وہ اپنی خالہ کے یہاں پہنچے۔ پہنچتے ہی انہوں نے نہانے کی فرمائش کی۔ ان کی خالہ نے کہا: "بیٹیا ذرا ٹھہرو۔ میں پانی گرم کیے دیتی ہوں۔ تھوڑی دیر بعد نہا لینا۔"

ارشد میاں نے دل میں سوچا کہ رعب جمانے کا اس سے اچھا موقع اور کون سا ہاتھ آئے گا۔ گاؤں کے دوست جو ان سے ملنے کے لئے آئے ہیں ان پر بھی خوب اثر پڑے گا۔ لہذا فوراً بولے: "باسی پانی ہو گا، خالہ جان؟ میں تو اسی سے نہاتا ہوں۔"

ان کے دوستوں کو ان کی یہ بات سن کر ہنسی آگئی۔ ان میں سے ایک نے کہا: "بھیّا! سردی اس قدر زیادہ ہے کہ تازے پانی سے نہایا نہیں جاتا اور تم باسی پانی سے نہانے کی بات کر رہے ہو۔"

ارشد میاں فوراً بولے: "واہ! تم کیا جانو۔ ہمارے یہاں

تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ وہ جھوٹی شان کے لئے ٹھنڈے
پانی سے نہا تو ضرور لئے مگر سردی کے مارے ان کا
برا حال تھا۔ ان کی خالہ جان نے بڑے پیار سے کہا:
"بیٹا! میں تمہارے لئے چائے بنا دیتی ہوں۔ دو گھونٹ
پی لینا۔ ساری سردی جاتی رہے گی۔"

ارشد میاں تڑاخ سے بولے: "واہ خالہ جان! بھلا
نہانے کے بعد بھی کہیں چائے پی جاتی ہے۔ ذرا
ٹھنڈا سا شربت، برف ڈال کر بنا دیں۔ ہم لوگ شہر
میں نہا کر یہی پیتے ہیں۔"

سب نے منع کیا، مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔
بولے: "واہ تم کیا جانو! ہمارے شہروں کی تو یہی
ریت ہے۔"

ان کی شان اور ہٹ دھرمی کے سامنے کس
کی چل سکتی تھی۔ آخر کار ان کے لئے ٹھنڈے پانی کا
شربت بنا دیا گیا۔ یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ سردیوں
میں وہاں برف کا ملنا نا ممکن تھا۔

ارشد میاں نے سوچا کہ بنڈی، مرزئی، کوٹ اور گرم کپڑوں کا استعمال تو سردیوں میں سب ہی کرتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے ململ کا کرتہ اور ہلکی سی دھوتی نکالی اور انہیں پہن کر گاؤں کی سیر کو نکلے۔ لوگوں نے پوچھا: "ارشد میاں! یہ کیا؟ اتنی سردی میں گرمیوں کے کپڑے؟"

ارشد میاں بڑے فخریہ انداز میں بولے: "واہ تم کیا جانو! جاڑوں کا صحیح لطف تو اسی لباس میں اٹھایا جا سکتا ہے۔" حالانکہ سردی کے مارے ان کا برا حال تھا۔ دوپہر اور رات کے کھانے میں اسی طرح انہوں نے ضد کر کے دکھاوے کے لئے خوب ٹھنڈی ٹھنڈی چیزیں کھائیں۔ لوگ انہیں حیرت سے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ شہروں میں نئی روشنی اور نئی تہذیب آئی ہے۔ ممکن ہے، وہاں ایسا ہی ہوتا ہو۔

جاڑوں کی وجہ سے سب لوگ بند کمروں میں لحاف

یا کمبل اوڑھ کر سوتے ہیں۔ ارشد نے سوچا کیوں نہ کوئی
نئی بات کی جائے تاکہ لوگوں پر ان کے شہری پن کا اور
بھی رعب جم جائے۔ حالانکہ انہیں خود بھی محسوس
ہو رہا تھا کہ ان کی طبیعت آہستہ آہستہ بگڑتی جارہی
ہے۔ لیکن جب رات کو سونے کے وقت ان کی
خالہ نے پلنگ پر گدّا بچھا کر ان کے لئے ایک اچھا
اور خوبصورت سا لحاف لاکر رکھ دیا تو ارشد میاں
ہنس کر بولے۔

"واہ خالہ، آپ بھی خوب ہیں۔ آج کل کھلی چھت
پر سونے میں جو لطف ہے، وہ بھلا بند کمروں
میں کہاں؟ میرے لئے تو آپ اوپر چھت پر ہی
پلنگ بچھوا دیں اگر ہو سکے تو تھوڑا بہت چھڑکاؤ
بھی کرا دیں۔ مچھر دانی لگوانا نہ بھولئے گا۔ میں تو اوپر
ہی سوؤں گا۔"

ان کی خالہ کے گھر کے لوگ یہ سُن کر بیحد متعجب
ہوئے۔ وہ بولے: "بھیّا، ایسا بھی شہری پن کیا؟

کیا شہر والے، ہم لوگوں سے اس قدر مختلف ہیں کہ وہ اتنی سردی میں کھلی چھت پر سوتے ہیں۔ اور جاڑوں میں مچھر؟

ارشد میاں بولے: "ارے آپ لوگ نہیں جانتے۔ اب سائنس بڑی ترقی کر چکی ہے۔ بڑی بڑی مشینیں بن گئی ہیں۔ جن کے ذریعے ہم چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی دیکھ لیتے ہیں۔ یہ مچھر جاڑوں میں کوٹ پہن کر نکلتے ہیں۔ آپ اس بات کو بھلا کیا جانیں!"

لوگوں کو یہ سُن کر بڑی حیرت ہوئی۔ کسی نے ہمّت کر کے پوچھ ہی لیا: "بھیّا یہ تو بالکل ہی نئی بات ہے۔ مچھّر اور کوٹ؟ ہمیں تو یقین نہیں آتا۔"

ارشد میاں بولے: "واہ کیا خوب ہے۔ تم لوگ یہ بھی نہیں جانتے کہ مچھّروں نے کس قدر ترقی کر لی ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے مشین کے ذریعے انہیں دیکھا ہے۔ تم لوگ بھلا کیا جانو۔ ہمارے شہروں میں تو یہ ایک عام سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔"

صبح جب کافی دیر تک ارشد میاں اوپر سے نہ اترے تو لوگوں کو بڑا تعجب ہوا۔ انہوں نے سوچا ہو سکتا ہے شہروں میں لوگ دیر تک سونے کے عادی ہوں۔

جب رات بھیگی تو ٹھنڈے پانی سے نہانا، ٹھنڈا شربت پینا اور کھلی چھت پر چھڑکاؤ کرا کر سونا رنگ لایا۔ رات کو جب سردی کڑاکے کی پڑی تو ارشد میاں کو نانی یاد آ گئی۔ دل میں کئی مرتبہ خیال آیا کہ نیچے چلے جائیں اور کسی لحاف میں گھس جائیں، مگر دکھاوا، بناوٹ اور جھوٹا گھمنڈ آڑے آتا رہا۔ اس میں انہوں نے اپنی ہار اور بے عزتی سمجھی۔ بہر کیف انہوں نے دری، چادر اور پھر مچھر دانی غرض کہ سب کچھ اوڑھ کر اپنی سردی دور کرنی چاہی۔ لیکن جب سردی ان چیزوں سے بھی دور نہ ہوئی تو چارپائی اوندھی کر کے اس کو بھی انہوں نے اپنے اوپر ڈال لیا۔ مگر سردی کم نہ ہوئی اور ان کی حالت بد سے بد تر ہوتی چلی گئی۔ آخر کار کچھ دیر بعد انہیں اپنا ہوش بھی نہ رہا۔

صبح سویرے ان کے دوست کافی تعداد میں جمع ہو گئے تھے۔ وہ سب یہ چاہتے تھے کہ ان سے شہر کے بارے میں نئی نئی معلومات حاصل کریں تاکہ جب کبھی ان کا شہر جانا ہو تو وہ ان باتوں سے فائدہ اٹھائیں۔

جب ارشد میاں کافی دیر تک نیچے نہ آئے تو ان کے دوستوں اور ملنے والوں نے ان کی خالہ سے ان کے بارے میں پوچھا۔ وہ بے چاری خود ہی حیران و پریشان تھیں۔ وہ بھلا کیا جواب دیتیں۔ بہرحال، کچھ دیر اور انتظار کرنے کے بعد سب لوگ ان کو دیکھنے اوپر چلے گئے۔

وہاں انہیں عجیب و غریب تماشہ نظر آیا۔ چارپائی ارشد میاں کے اوپر سو رہی تھی۔ پہلے تو ان کے دوستوں نے سمجھا کہ ممکن ہے، یہ بھی ارشد میاں کے سونے کی کوئی خاص ادا ہو۔ مگر جب ان کی موجودگی کے باوجود کافی دیر تک وہاں ذرا بھی کلبلاہٹ نہ ہوئی اور ہلکی ہلکی کراہنے کی آواز آئی تو ان کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ

لوگ ان کے قریب گئے تو دیکھا ارشد میاں کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ سردی سے وہ قریب قریب اکڑ چکے تھے۔ لوگوں نے جلدی جلدی انہیں وہاں سے اٹھایا۔ نیچے کمرے میں لے آئے۔ لحافوں کے اندر رکھا۔ انگیٹھیاں جلائیں۔ دوا وغیرہ پلائی۔ تب جا کر انہیں کچھ ہوش آیا اور انہوں نے نہایت کمزوری سے ذرا ذرا آنکھیں کھولیں۔ منہ سے ہلکی سی آواز آئی، "شہر!"

ایک مسخرا لڑکا جو قریب ہی کھڑا تھا۔ بولا: "ہاں ہاں، ارشد بھیا، کہو کہ شہر میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" اس لڑکے کی بات سُن کر سب لوگ ہنس پڑے۔ قریب ہی ارشد کی خالہ جان کھڑی تھیں۔ انہوں نے سب کو ڈانٹا اور سمجھایا: "دیکھو دوسروں کی غلطیوں اور برائیوں پر ہنسا نہیں کرتے۔ یہ ارشد میاں کی غلطی اور بھول تھی کہ وہ دکھاوے، بناوٹ اور جھوٹی شان کو ہی بڑائی سمجھتے تھے۔ ہمیں چاہیئے کہ ان ظاہری چیزوں پر نہ جائیں۔ آدمی کی عزت دکھاوے سے نہیں ہوتی۔ جھوٹا گھمنڈ انسان کو کہیں کا نہیں

رہنے دیتا۔ آدمی کی عزت اچھی باتوں اور سیدھی سادی زندگی سے ہوتی ہے نہ کہ ظاہری اور جھوٹی آن بان اور شان سے۔" خالہ جان کی باتیں سب کو اچھی لگیں۔

دوائیں پی کر اور لوگوں کی دعاؤں کے اثر سے ارشد میاں تھوڑے ہی دنوں میں بھلے چنگے ہو گئے۔

اس کے بعد لوگوں نے انہیں پھر کبھی یہ کہتے ہوئے نہیں سنا کہ واہ تم کیا جانو! تم لوگ گاؤں کے سیدھے سادے لوگ ہو۔ ہمارے شہروں کی تو یہی ریت ہے۔

تین ٹھگ

ایک مسافر گھوڑے پر سوار کہیں جا رہا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کی دُم سے ایک بکری باندھی ہوئی تھی۔ چلتے چلتے وہ ایک گاؤں کے قریب سے گذرا۔ اس گاؤں میں تین ٹھگ رہتے تھے جو بڑے چالاک اور مکّار تھے۔ مسافروں کو بے وقوف بنا کر دھوکے سے ان کا مال ہتھیانا ان کا مشغلہ تھا۔ ان تینوں ٹھگوں نے اس مسافر کو تاڑا اور آپس میں یہ طے کیا کہ اسے بے وقوف بنا کر اس کی چیزیں اڑا لی جائیں۔

ایک ٹھگ نے کہا کہ میں مسافر کو چکمہ دے کر اس

کے گھوڑے کی دُم سے بندھی ہوئی بکری لے اڑوں گا۔ دوسرے نے اپنے اس ارادے کا اظہار کیا کہ میں اس کا گھوڑا ہتھیا لوں گا۔ تیسرے نے یہ عزم کیا کہ میں اس کے جسم کے کپڑے بھی لے لوں گا۔

مسافر نے احتیاط کے طور پر بکری کے گلے میں ایک گھنٹی باندھ رکھی تھی۔ بکری کے چلنے سے گھنٹی بجتی تھی اور یوں اسے اندازہ ہوتا رہتا تھا کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔ آخر چلتے چلتے مسافر کا گھوڑا ہانپنے لگا۔ اور سخت پیاس کی وجہ سے اس کی زبان باہر نکل آئی۔ مسافر نے پانی کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔

اسی دوران ایک ٹھگ اس کے پاس آیا اور اس نے بڑی محبّت سے اس سے پوچھا: "بھائی مسافر! تم کو کس چیز کی تلاش ہے؟ جس چیز کی ضرورت ہو مجھے بتاؤ۔ راہگیروں اور مسافر کی خدمت کر کے مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔"

مسافر سیدھا سادہ اور بھولا بھالا تھا۔ وہ اس ٹھگ کو شریف اور نیک دل آدمی سمجھا اور بولا۔" اے بھائی! میں پانی کی تلاش میں ہوں۔ میرا گھوڑا بہت پیاسا ہے۔ اگر آپ مجھے کنویں یا تالاب تک پہنچا دیں۔ تو آپ کی بڑی عنایت ہو گی۔"

ٹھگ نے کہا:" آپ ہمارے مہمان ہیں اور مہمان کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔ بہتر تو یہ رہے گا کہ آج آپ ہمارے گھر میں ٹھہریں اور تھکن اتارنے کے لئے آرام کریں۔ پھر کل یہاں سے آگے روانہ ہوں۔ ویسے قریب ہی ایک تالاب ہے۔ آپ وہاں جا کر اپنے گھوڑے کو پانی پلا سکتے ہیں۔"

مسافر نے ٹھگ کا شکریہ ادا کیا اور کہا:" مجھے آج ہی ایک ضروری کام سے شہر پہنچنا ہے۔ آپ بس اتنی مہربانی کریں کہ مجھے تالاب کا راستہ بتا دیں"۔ ٹھگ مسافر کو تالاب پر لے گیا۔ مسافر کو شہر جانے کی جلدی تھی۔ اس نے گھوڑے سے اترنے میں وقت ضائع کرنا

مناسب نہ سمجھا اور گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی اُسے پانی پلانے لگا۔ ٹھگ اس سے اجازت لے کر واپس ہوا۔ جانے سے پہلے اس نے بڑی صفائی سے بکری کی رسّی گھوڑے کی دُم سے کھولی اور گھنٹی بکری کے گلے سے کھول کر گھوڑے کی دُم سے باندھ دی۔ بکری کی طرف مسافر کی پیٹھ تھی، اس لئے وہ ٹھگ کی اس حرکت کو نہ دیکھ سکا۔

مسافر نے گھوڑے کو پانی پلایا اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہوا۔ گھنٹی گھوڑے کی دُم میں بندھی رہی تھی اور برابر بج رہی تھی۔ مسافر کو یہ پتہ نہ چلا کہ کوئی اس کی بکری کھول کر چمپت ہو گیا ہے۔

کچھ دور چلنے کے بعد اسے ایک اور شخص ملا۔ یہ بھی ان تین ٹھگوں میں سے ایک تھا۔ وہ راستے کے ایک طرف کھڑا مسافر کو دیکھ کر زور زور سے ہنس رہا تھا۔ اسکے اس طرح ہنسنے پر مسافر کو حیرت ہوئی اور غصّہ بھی آیا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو روکا اور اس شخص سے ہنسنے کی وجہ

دریافت کی ۔ ٹھگ اور بھی زیادہ زور سے ہنسنے لگا۔ آخر مسافر کے بار بار پوچھنے پر اس نے جواب دیا: "میں تمہاری معصومیت اور بھولے پن پر ہنس رہا ہوں۔ کوئی شخص بھی ایسی حماقت نہیں کرتا جیسی تم نے کی ہے۔"

"میں نے ایسی کون سی حماقت کی ہے، جس پر تم اس طرح ہنس رہے ہو؟" مسافر نے بگڑ کر اس سے پوچھا۔

ٹھگ نے جواب دیا: "تمہاری حماقت یہ ہے کہ تم نے گھوڑے کی دُم میں گھنٹی باندھ رکھی ہے۔ گھنٹی گھوڑے کے گلے میں باندھی جاتی ہے یا اس کی دُم میں؟"

مسافر یہ سن کر گھبرا گیا۔ اس نے فوراً پلٹ کر دیکھا تو واقعی بکری کے گلے میں بندھی ہوئی گھنٹی گھوڑے کی دُم میں بندھی ہوئی تھی۔ اور بکری غائب تھی۔

مسافر نے کہا: "میری حماقت پر تمہارا ہنسنا بجا ہے۔ مگر بھائی، میرے ساتھ بہت بڑا دھوکہ ہوا ہے۔ میں نے گھوڑے کے پیچھے اپنی بکری باندھ رکھی تھی اور گھنٹی اسی کے گلے میں تھی تاکہ اس کے بجنے سے مجھے معلوم ہوتا رہے کہ بکری

موجود ہے۔ مگر کسی نے میرے ساتھ شرارت کی ہے۔ وہ میری بکری کھول کر لے گیا ہے اور اس کی گھنٹی گھوڑے کی دُم سے باندھ دی ہے۔"

"کیا تمہاری بکری کا رنگ کالا اور سفید تھا"؟ ٹھگ نے دریافت کیا۔

"ہاں، وہ اسی رنگ کی تھی۔ کیا تم نے اُسے دیکھا ہے"؟

ہاں، ابھی ذرا دیر پہلے ایک شخص ایسے ہی رنگ کی بکری لے کر اس جنگل میں گھسا ہے۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہو گا۔ دوڑ کر جاؤ اور اسے پکڑ لو۔" ٹھگ نے کہا۔

"ٹھیک ہے میں ابھی گھوڑے پر سرپٹ جاتا ہوں۔ اُسے پکڑ کر ایسی سزا دونگا کہ وہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔" مسافر غصّے سے دانت پیستے ہوئے بولا۔

"نہیں، گھوڑے پر جانے کی غلطی نہ کرنا۔ جنگل بے حد گھنا ہے۔ اس کے اندر گھوڑا نہیں دوڑ سکتا۔

تم خود ہی دوڑتے ہوئے جاؤ۔ جب تک تم واپس آؤ گے، میں یہیں تمہارے گھوڑے کی حفاظت کرتا رہونگا۔ اپنا گھوڑا میرے پاس چھوڑ جاؤ۔"

مسافر جیسا خود سیدھا اور شریف تھا ویسا ہی دوسروں کو بھی سمجھتا تھا۔ اس نے ٹھگ کی باتوں کا یقین کر لیا اور اپنا گھوڑا اُس کے پاس چھوڑ کر جنگل میں گھس گیا۔ بڑی دیر تک وہ اپنی بکری کی تلاش میں جنگل میں اِدھر اُدھر بھٹکتا رہا، مگر بکری اور بکری کے چور کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ آخر مایوس ہو کر اسے لوٹنا پڑا۔ مگر جب وہ اس جگہ واپس آیا جہاں گھوڑا چھوڑ کر گیا تھا تو نہ وہاں اجنبی تھا اور نہ ہی اس کا گھوڑا۔ دوسرا ٹھگ اس کا گھوڑا لے کر جا چکا تھا۔

مسافر تھکا ماندہ پریشانی کے عالم میں ایک کنویں کے پاس پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں ایک شخص بیٹھا، پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے اور بار بار اپنا

سر کنوئیں کی دیوار سے ٹکرا رہا ہے۔ مسافر نے اس شخص سے رونے کی وجہ دریافت کی تو اس نے بتایا کہ میں ہیروں کا سوداگر ہوں۔ سفر کرتا دور سے آرہا ہوں۔ ابھی کچھ دیر پہلے تھک کر اس کنوئیں پر آرام کرنے اور پانی پینے کی غرض سے میں بیٹھا تھا اور ہیروں سے بھری اپنی صندوقچی کو کنوئیں کے چبوترے پر رکھ دیا تھا۔ یہ صندوقچی چبوترے کی چکناہٹ کی وجہ سے پھسل کر کنوئیں میں گر گئی۔ اور یوں وہ اپنی اس بے بہا دولت سے محروم ہو گیا ہے۔

مسافر نے اس سوداگر سے کہا: "رونے دھونے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ کنوئیں میں کسی ترکیب سے اترو اور صندوقچی نکال لاؤ۔"

سوداگر نے جواب دیا: "میں کنوئیں میں اترنا نہیں جانتا اور نہ ہی پانی میں غوطہ لگانا جانتا ہوں۔ ابھی اس سامنے کے گاؤں میں گیا تھا۔ وہاں سے رستہ مانگ کر لایا ہوں۔ گاؤں میں غوطہ خور نہ مل سکا۔ وہ

شہر گیا ہوا ہے۔ نہ جانے کب اس کی واپسی ہو۔
اب میں کسی ایسے شخص کی تلاش میں ہوں جو کنویں
میں اترنا اور غوطہ لگانا جانتا ہو۔ جو آدمی میرا صندوق
نکال کر لائے گا میں اسے اپنی آدھی دولت دے
دوں گا۔"

مسافر اس لالچ میں آ گیا۔ اس نے سوچا کیوں
نہ یہ کام میں ہی کر دوں۔ اس طرح اس کی مدد بھی
ہو جائے گی اور مجھے دولت بھی مل جائے گی۔
میں جو اپنی بکری اور گھوڑا کھو چکا ہوں، اس رقم سے
ایسے کئی گھوڑے اور بکریاں خرید سکوں گا۔ وہ بیچارہ
زیادہ سوچ بچار کرنے کا عادی نہ تھا۔ دوسروں کی
بات پر فوراً یقین کر لیتا تھا۔ لہذا وہ کنویں سے صندوقچی
نکالنے پر تیار ہو گیا۔ اس نے اپنے کپڑے جو
بہت قیمتی تھے، اتار کر ایک طرف رکھ دیئے
اور سوداگر نے اسے رسّے کی مدد سے کنویں
میں اتار دیا۔ جب مسافر کنویں میں اتر گیا تو اس

نے آہستہ سے رسّہ چھوڑ دیا اور بڑے اطمینان سے
مسافر کی بیش قیمت پوشاک اٹھا کر چلتا بنا۔ یہ
شخص سوداگر نہیں تھا بلکہ تیسرا ٹھگ تھا جس کے فریب
میں آ کر بے وقوف مسافر کنوئیں کی گہرائیوں میں چیختا
چلاّتا ہی رہ گیا۔

کاہلی کی سزا

چھٹو اور بدھو دونوں بھائی اوّل درجے کے کاہل تھے۔ رات دن پڑے پڑے چارپائیاں توڑا کرتے ماں بے چاری انہیں بہت سمجھاتی کہ بیٹا، اس کاہلی کو چھوڑدو اور محنت کرو، ورنہ بڑے ہو کر روٹیوں تک کے محتاج ہو جاؤ گے مگر ان کے کانوں پر جُوں تک نہ رینگتی تھی۔

بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر ماں نے انہیں گاؤں کے مدرسے میں داخل کرا دیا۔ مگر ان دونوں کے لئے یہ بڑی پریشانی کی بات تھی کہ

انہیں صبح سویرے اٹھنا پڑے گا۔

چنّو نے بدھّو سے کہا: "بدھّو بھیّا! اسکول جس وقت لگتا ہے اس وقت تو ہم دونوں سو رہے ہوتے ہیں۔ ہم اسکول کس طرح جائیں گے"۔

"ارے بھائی! مفت میں دماغ کیوں کھپاتے ہو۔ صبح سویرے اماں اٹھا دیا کریں گی"۔ بدھّو نے چنّو کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

یہ سن کر چنّو کو کچھ اطمینان ہوا۔ مگر دوسرے دن جب ان کی ماں نے صبح سویرے اٹھایا تو انہیں اٹھتے اٹھتے کافی دیر ہو گئی اور وہ پہلے ہی دن اسکول دیر سے پہنچے۔ ماسٹر صاحب نے دونوں کو اس کی سزا دی۔ اس دن کی سزا کا ان پر اچھا اثر پڑا۔ انہوں نے طے کر لیا کہ اب وقت پر اسکول جایا کریں گے۔ ماں کو تاکید کر دی گئی کہ انہیں روزانہ سویرے وقت پر

اٹھا دیا کریں ۔ دوسرے دن صبح سویرے ماں نے
دونوں کو جگایا: "اٹھو بیٹا، دیکھو املی کے درخت
کے اوپر سورج کی کرنیں ناچ رہی ہیں ۔ منہ ہاتھ
دھوؤ، ناشتہ کرو، اور اسکول جاؤ"۔

"ہاں، ہاں اٹھتے ہیں ماں ۔ کون سی ایسی ریل
چھوٹی جا رہی ہے"۔ چنّو انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔

دوسری طرف سے بدّھو کی آواز آئی: "بھیّا چنو!
ذرا اٹھانا مجھے ہاتھ پکڑ کر۔ اس وقت تو اٹھنے
کو جی بالکل نہیں چاہتا"۔

چنّو غرّایا: "واہ، تم خود کیوں نہیں اٹھتے؟ ۔ ارے
خود اٹھو اور ذرا مجھے بھی سہارا دے کر
اٹھاؤ"۔

دونوں ایک دوسرے سے خفا ہو گئے ۔ آخر
ماں نے ہی دونوں کو اٹھایا اور منہ ہاتھ دھلا
کر اسکول بھیجا۔ جب وہ اسکول پہنچے تو دیکھا کہ
ماسٹر صاحب کلاس کے لڑکوں کو سمجھا رہے تھے

"ہمیں سستی اور کاہلی کو اپنے پاس بھی نہیں پھٹکنے دینا چاہیئے۔ آدمی کی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہیں۔ دیکھو بچّو! اگر تم بڑے آدمی بننا چاہتے ہو تو ان سے چھٹکارا پاؤ۔ محنت اور جدوجہد سے تم بڑے سے بڑا کام بھی کر سکوگے۔ پھر تمہاری شہرت دنیا کے چاروں کونوں میں پھیل جائے گی۔"

یہ سن کر بدّھو سے نہ رہا گیا۔ اس نے ماسٹر صاحب سے پوچھا۔ "واہ ماسٹر صاحب، واہ! اُس دن تو آپ یہ پڑھا رہے تھے کہ دنیا گول ہے بھلا یہ شہرت دنیا کے چاروں کونوں میں کس طرح پھیلے گی؟ کہیں گول چیز کے بھلا کونے ہوتے ہیں؟"

اس کے اس سوال پر پوری کلاس قہقہوں سے گونج اٹھی۔

ایک دن ماسٹر صاحب نے چینو سے سوال کیا:

"بتاؤ چنّو، اگر تمہارے پاس پندرہ روپے ہوں،
اور تمہیں پچپس پچپس پیسے والی کاپیاں خریدنی ہوں
تو تمہیں دوکاندار کتنی کاپیاں دے گا؟"
چنّو سر کھجاتے ہوئے کاہلی سے بولے :
"ماسٹر صاحب! اس میں پریشان ہونے کی کون
سی بات ہے۔ اس رقم میں جتنی کاپیاں آئیں
گی۔ دوکاندار خود دے دے گا۔ آخر حساب
کرنے کی دردِ سری سے کیا فائدہ؟"
اسکول میں یہ دونوں بھائی بالکل پڑھتے لکھتے
نہ تھے۔ ان کی کاہلی اور سستی جوں کی توں رہی۔
آخر وہی ہوا جس کا ڈر ان کی ماں کو پہلے ہی
دن سے تھا۔ دونوں امتحان میں فیل ہو گئے اور
اسکول سے ان کے نام کاٹ دیئے گئے۔ ماں
ان دونوں کی حالت دیکھ کر بہت پریشان تھی۔
وہ اکثر سوچا کرتی کہ اگر ان کی یہی حالت رہی
تو آگے چل کر ان کا کیا ہو گا۔ مگر بدھّو اور

چنّو ذرا پروا نہ کرتے اور مزے سے پڑے پڑے آرام کیا کرتے۔

کچھ دن بعد انہیں کسی دوسرے گاؤں میں شادی پر جانا تھا۔ ان کی ماں کی طبیعت خراب تھی اور وہ جا نہیں سکتی تھیں۔ اس نے ان دونوں کو سمجھایا کہ وہاں جا کر کوئی ایسی حرکت نہ کریں جس سے ان کی بدنامی ہو اور لوگ انہیں سست، کاہل اور بے وقوف کہیں، دونوں کو ماں کی یہ نصیحت بہت بری لگی۔ انہوں نے کہا: "اماں! آخر آپ ہمیں اس قدر احمق کیوں سمجھتی ہیں؟۔ ہم اپنا اچھا بُرا خوب سمجھتے ہیں"۔

دوسرے گاؤں جانے کے لئے کوئی سواری نہ تھی۔ لہذا دونوں پیدل ہی روانہ ہوئے۔ کچھ دور چل کر بدھو بولا "بھیا چنّو! اب تو بہت تھک گئے ہیں۔ آگے قدم بڑھایا نہیں جاتا۔ آؤ کچھ دیر اس آم کے پیڑ کے نیچے سستا لیں"۔

"خوب، تم نے میرے منہ کی بات چھین لی، میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔" دونوں اس سایہ دار آم کے درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ پھر لیٹ گئے۔ ہوا کے ہلکے ہلکے ٹھنڈے جھونکوں نے انہیں جلد ہی سلا دیا۔

دن ڈھلے ان کی آنکھ کھلی۔ بھوک کے مارے ان کا برا حال تھا۔ قریب ہی ایک پکا ہوا آم پڑا تھا۔ چنّو بولا۔ "بدّھو بھیّا! بھوک بہت زور کی لگی ہے۔ ذرا اس آم کو اٹھا کر میرے منہ میں نچوڑ دینا۔"

بدّھو غصّے میں آ کر بولا۔ "واہ، یہ خوب رہی! میرا حال تو تم سے بھی زیادہ خراب ہے۔ تم خود ہی ذرا اسے اٹھا کر میرے منہ میں نچوڑ دو نا!"

دونوں آپس میں لڑ جھگڑ کر خاموش ہو گئے۔ آم جوں کا توں وہیں پڑا رہا۔

اتفاق سے ایک راہگیر اُدھر سے گزر رہا تھا۔
بدھو زور سے چیخا: "بھائی صاحب! تھوڑا سا
پانی اُس چشمے سے لا دو، مجھے بڑی پیاس
لگی ہے"۔

راہ گیر سمجھا شاید دونوں بیمار ہیں۔ اسے ان
پر رحم آ گیا۔ وہ دوڑا دوڑا گیا اور ان
کے لئے پانی لے آیا۔ دونوں نے خوب
پانی پیا۔

چھٹو نے اس مسافر سے کہا: "بھیّا ذرا دو
چار چھینٹوں سے ہمارا منہ بھی دھو دو"۔ راہگیر
نے ان کے منہ بھی دھلا دیے۔

اب بدّھو اطمینان کا سانس لے کر بولا۔
"اے میرے بھائی! اصل بات یہ ہے کہ ہماری
ماں نے ہمیں نصیحت کی تھی کہ کوئی چیز منہ
دھوئے بغیر نہ کھایا کرو۔ اب ایک اور کام
کرو۔ اس آم کو ہمارے منہ میں نچوڑ دو"۔

راہگیر ان کی باتوں سے سمجھ گیا کہ یہ دونوں پرلے درجے کے کاہل اور سست ہیں۔ اسے ان پر سخت غصہ آیا۔ اس نے آم اٹھایا اور خود چوستا ہوا چل پڑا۔ دونوں چیختے چلاتے رہ گئے۔

تھک ہار کر آخرکار یہ دونوں پھر اپنی منزل کی طرف بڑھے۔ بھوک کے مارے ان کا برا حال تھا۔ راستے میں انہیں ایک فقیر ملا۔ اس نے گڑگڑا کر ان سے بھیک مانگی۔ چنّو اور بدّھو دونوں کو فقیر پر رحم آگیا۔ چنّو نے کہا۔ "بھیّا بدھّو! ذرا میری جیب سے دس پیسے نکال کر بابا کو دے دو۔"

بدّھو آپے سے باہر ہوتے ہوئے بولا:
"واہ، بھئی، واہ! کاہلی کی بھی حد ہو گئی۔ کیا میں تمہارا نوکر ہوں؟ خود جیب سے پیسے نکال کر دو۔ اگر اپنی جیب سے پیسے نہ دینا چاہو تو

میری جیب سے نکال کر دے دو۔"
دونوں اسی طرح آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے
کہ فقیر نے اس مسئلے کا حل پیش کیا اور اس
نے کہا: "کیا میں خود دس دس پیسے آپ
دونوں کی جیبوں سے نکال لوں؟"
"کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ نیکی اور پوچھ
پوچھ۔ پیسے نکال لو بابا۔ مگر دس دس پیسے
ہی نکالنا۔ ہمیں ابھی کھانا بھی کھانا ہے" دونوں
خوشی سے پھولے نہ سما رہے تھے۔ ان کی
ایک بڑی الجھن خود ہی دور ہو رہی تھی۔
کچھ دور چل کر سڑک کے کنارے انہیں
ایک ہوٹل نظر آیا۔ گرم گرم روٹی اور سالن
کی مہک نے انہیں بے تاب کر دیا۔ دونوں
لپکتے ہوئے ہوٹل میں پہنچے اور خوب پیٹ
بھر کر کھانا کھایا۔ پیسے دیتے وقت دونوں
کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی کیونکہ ان

کی جیبیں بالکل خالی تھیں۔ فقیر موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سارے پیسے نکال کر لے گیا تھا۔ ہوٹل والے نے پیسے نہ ملنے پر دونوں کی خوب پٹائی کی اور ان کے کپڑے بھی اتروا لیے۔ دونوں چھوٹے جانگیے پہنے سڑک پر منہ بسورے کھڑے تھے۔ چنّو بولا: "بھیّا بدھّو اس حالت میں ہم شادی میں کیسے جا سکتے ہیں۔ تمام لوگ ہنسیں گے۔ چلو گھر لوٹ چلیں۔"

تھکے تھکے اور بوجھل قدموں سے دونوں اپنے گھر کی طرف واپس لوٹے۔ چلتے چلتے بدّھو نے کہا: "بھیّا چنّو، اپنی سمجھ میں تو ایک بات آتی ہے۔ ماں ٹھیک ہی کہتی ہے کہ ہماری یہ سستی اور کاہلی ہمیں کہیں کا نہ چھوڑے گی۔ دیکھو کاہلی اور سستی کی وجہ سے ہی آج ہماری یہ درگت ہوئی ہے۔"

چنّو بولا: "بھیّا! سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں،

آج کا یہ سبق ہمارے لئے کافی ہے۔ آؤ، سچے دل سے اب عہد کریں کہ سستی اور کاہلی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ دیں گے۔ خوب محنت سے اپنا کام کریں گے اور پڑھیں لکھیں گے۔"

دونوں اپنے فیصلے پر مسکرا اٹھے۔ چستی اور پھرتیلے پن کی کرنیں ان کے چہروں پر ناچنے لگیں۔ اور پھر وہ دونوں تیزی سے اپنے گھر کی طرف قدم بڑھانے لگے۔

چنبیلی کے پھول

ننھی دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور اپنی منّی سی مٹھی نچاتے ہوئے مجھ سے پوچھنے لگی: "بتاؤ بھیّا، میں آپ کے لئے کیا چیز لائی ہوں؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا: "ریل گاڑی ہوگی یا جہاز ہوگا۔"

ہونہہ! آپ اتنا بھی نہیں جانتے۔ بھلا اتنی بڑی بڑی چیزیں میرے ہاتھ میں کیسے آسکتی ہیں؟"

"اچھا پھر تم ہی بتاؤ اس میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے دونوں ہاتھ کھول دیے۔ اور چنبیلی کے پھول

مہک اٹھے۔

"اوہو، تو تم میرے لئے پھول لائی ہو۔ میں نے اس سے پھول لے کر دو چار بار سونگھا اور پھر اپنے تکیے کے قریب رکھ لیے۔

" پانی پلاؤں، بھیا؟ اس نے پوچھا۔

"نہیں پیاس نہیں ہے"۔ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"سر دبا دوں، آپ کا؟" اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے سے ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیے۔ میں اس کی ان باتوں سے سمجھ گیا کہ اس میں ضرور کچھ مطلب پوشیدہ ہے، ورنہ ہماری اس قدر خاطر داری کیوں ہوتی۔ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا: "آخر مقصد کیا ہے، آپ کا؟"

"کچھ نہیں بس یونہی" اس نے جواب دیا۔

"کچھ تو ہے، آخر کچھ تو بتاؤ؟" میں نے مزید سوال کیا۔

اور پھر وہ بڑے مزے سے میرے بستر پر لیٹتے ہوئے بولی: "کہانی سنائیے۔ اچھی سی، میرے بھائی جان!"

"اُوہو، تو سب کچھ اسی وجہ سے ہو رہا تھا۔ جاؤ، مجھے کہانی وہانی نہیں آتی۔ اپنی بجیا سے جاکر سنو۔ انہیں کہانیاں بہت آتی ہیں۔"

"ہم تو آج آپ سے ہی سُنیں گے۔" وہ ضد کرنے لگی۔

"اچھی زبردستی ہے! بھئی، مجھے کہانیاں نہیں آتیں۔ دیکھو، بجیا کو بہت سی مزے مزے کی کہانیاں آتی ہیں۔ جاؤ انہی سے سنو۔"

"وہ ہمیں کہانی نہیں سنائیں گی۔ ان سے ہماری کُٹّی ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"کیوں، کُٹّی کیوں ہو گئی؟" میں نے پوچھا۔

"صبح انہوں نے ہم سے اپنا پین اور رائیٹنگ پیڈ منگوایا تھا۔ وہ ہر وقت ہم سے ہی کام کراتی ہیں، بھائی جان۔ ہم نے انہیں منع کر دیا۔ بس اسی وقت سے وہ خفا ہیں۔ ہم سے بول بھی نہیں رہی ہیں۔"

"تو، تم نے ان کا کہنا نہیں مانا۔ یہ تو بہت بُری بات ہے، ننھی۔ اچھے بچے ہمیشہ اپنے بڑوں کا کہنا مانتے ہیں۔"

"ہونہہ ہر وقت وہ ہم سے کام کراتی ہیں۔" ننھی مچل کر بولی۔ "ہم کچھ نہیں جانتے۔ اب تو آپ کو کہانی سنانی ہی پڑے گی۔"

"مجھے کہانی سنانا نہیں آتی۔ جاؤ جاکر سو جاؤ" میں نے اسے سمجھاتے ہوتے کہا۔

"نیند نہیں آرہی ہے۔ سنا ئیے نا۔ ہم نے تو آپ کو اتنے اچھے پھول لاکر دئے ہیں۔ دیکھئے کیسی بھینی بھینی خوشبو آرہی ہے، ان میں سے۔"

"ہاں۔ ہاں۔" اور میں نے دو چار پھول اٹھاکر پھر سونگھے۔ واقعی بہت خوبصورت اور خوشبودار تھے وہ پھول۔ اور پھر میں سوچنے لگا۔

"بھیّا، سناؤ نا کہانی۔" ننھی نے پھر اصرار کیا۔

"کیا واقعی تم کہانی سُنو گی؟"

"ہاں۔ ہاں۔ اور کیا؟ خوب اچھی اور مزے دار سی کہانی۔"

"اچھا، تو پھر آرام سے بیٹھ جاؤ اور سنو۔"

اب سے ہزاروں سال پہلے کی بات ہے، جب یہ دنیا

ایسی نہ تھی اور نہ ہی یہ تمام چیزیں، جیسی آج نظر آتی ہیں' اس قسم کی تھیں۔ مگر یہ چاند، ستارے اور سورج اسی طرح آسمان پر چمکا کرتے تھے۔ آج تک ان کے روزمرہ کے معمول میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا۔ سورج روزانہ ٹھیک اپنے وقت پر نکلتا۔ ایسے نہیں، جیسے بچے اسکول جانے میں کبھی کبھار دیر کر دیتے ہیں۔ سورج، چاند اور ستارے اپنا کام وقت پر پورے شوق اور محنت سے کرتے تھے۔ کبھی آج کا کام کل پر اور کل کا کام پرسوں پر نہ ڈالتے تھے۔ ایک دوسرے کا کہنا بھی مانتے تھے۔ بڑے چھوٹوں کا لحاظ کرتے اور چھوٹے بڑوں کا ادب کرتے تھے۔ جیسے ہی کسی نے کوئی بات کہی، فوراً اس کا کہنا مان لیا۔ یہ نہیں کہ بڑوں کی بات ٹال دی۔ سورج چونکہ چاند اور ستاروں میں سب سے بڑا تھا، اس لئے چاند اور ستارے اس کا کہنا مانتے تھے اور اگر چاند ستاروں سے کسی کام کے لئے کہتا تو ستاروں کی

کیا مجال کہ اس کا حکم نہ مانیں۔

ایک رات ساری دنیا میں غضب کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، جیسا اب بھی کبھی کبھی ہو جاتا ہے۔ اس دن چندا ماموں کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ انہوں نے سوچا کہ آج رات آرام کیا جائے۔ سورج کی ڈیوٹی دن بھر کی انتھک محنت کے بعد ختم ہو چکی تھی۔ اس وقت چندا ماموں کا ہی کام تھا کہ وہ دنیا کو روشنی پہنچائیں۔ مگر طبیعت کی خرابی کی وجہ سے، یہ کام اس وقت ان کے لئے ناممکن تھا۔ لہٰذا انہوں نے سب تاروں کو جمع کیا اور کہا: "دیکھو، آج تم لوگ خوب اچھی طرح سے اور تیزی سے چمکنا۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ دیکھو، دنیا والوں کو ذرا بھی تکلیف نہ پہنچے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم خوب چمک چمک کر اور دمک دمک کر دنیا کے اندھیروں کا خاتمہ

کریں، ورنہ دنیا والوں کو بڑی دشواری اور مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ راہ گیر اپنے راستوں سے بھٹک جائیں گے۔ انہیں راستہ ذرا بھی نہ سوجھے گا اور وہ اینٹوں اور پتھروں سے ٹکراتے پھریں گے۔" اس طرح خوب اچھی طرح سے ستاروں کو سمجھا کر چندا ماموں اپنے گھر کو چلے گئے۔

کچھ دیر تک چندا ماموں اپنی مسہری پر آرام سے پڑے رہے۔ پھر انہوں نے سوچا ذرا جھانک کر دیکھوں تو سہی کہ تارے اپنا اپنا کام ٹھیک طرح سے کر بھی رہے ہیں یا نہیں۔ انہوں نے چپکے سے، اپنے دروازے کی آڑ سے جھانک کر دیکھا۔ دیکھتے کیا ہیں کہ کچھ تارے منہ چھپائے، پڑے سو رہے ہیں اور روشنی پھیلانے کا کام چھوڑ رکھا ہے۔ چندا ماموں کو بڑا غصہ آیا۔ انہوں نے ان سوئے ہوئے تاروں کو جگایا اور انہیں خوب ڈانٹا پھٹکارا۔ وہ تارے، ننھے بڑے

منہ پھٹ۔ انہوں نے کہا: ”ہمیں تو نیند آ رہی ہے۔
اس وقت ہم نہیں چمکیں گے۔“ یہ جواب سن
کر چندا ماموں کو بہت زیادہ غصّہ آگیا۔ انہوں
نے کہا: ” یہ تمہارے کام کا وقت ہے یا آرام
کا؟“ مگر ان تاروں نے چندا ماموں کی بات ایک
کان سے سن کر دوسرے کان سے اُڑا دی۔

چندا ماموں غصّے کے مارے کانپنے لگے۔ انہوں
نے ان تاروں کو حکم دیا کہ ابھی اور اسی وقت ،
میری حکومت کی سرحدوں سے ، نکل جاؤ۔ وہ
تارے بڑے ضدّی تھے۔ بولے۔ ” ہاں ، ہاں
ابھی چلے جاتے ہیں - ہم لوگ اب خود بھی یہاں
رہنا پسند نہیں کرتے۔“ بس پھر کیا ہوا کہ کہنا نہ
ماننے کی سزا میں ، انہیں زمین پر گرا دیا گیا۔
وہ ہماری زمین پر ایسی جگہ گرے ، جو بڑی سخت
اور پتھریلی تھی - کہاں آسمان اور کہاں زمین! پتھریلی
اور سنگلاخ - چاروں طرف سائیں سائیں کرتا

ہوا خوفناک اندھیرا ، وہ حُسن ، وہ خوبصورتی اور دلکشی اب کہاں ؟ نہ جان نہ پہچان ، اجنبیوں کیطرح وہ زمین پر پڑے رہے ۔ اب وہ اپنے کئے پر پچھتا رہے تھے مگر اب پچھتانے سے کیا فائدہ ؟

جیسے تیسے انہوں نے رات رو پیٹ کر گذاری ۔ صبح جب ، مشرق کے لال لال پردوں سے نکل کر سورج نے اپنی سنہری کرنوں سے اس دھرتی کو روشن کر دیا تو ان تاروں نے رو رو کر اپنا سارا قصہ سورج کو سنایا اور اس سے درخواست کی کہ وہ چندا ماموں سے ان کا قصور معاف کرا دیں ۔ انہوں نے گڑگڑا کر التجائیں کیں ۔ ہمیں پھر واپس آسمان پر بلا لیا جائے ۔ اب ہم کسی بڑے کا کہنا کبھی نہیں ٹالیں گے ۔

سورج نے کہا : ”بھئی ، میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا ۔ تم لوگ جانو اور چندا ماموں جانیں ۔ تمہاری غلطی ہے ۔ اب تم لوگ اپنی غلطی کی سزا بھگتو“

جب تارے بہت روئے اور گڑگڑائے تو سورج کا دل کچھ پسیجا۔ اس نے کہا: "اچھا، میں چندا ماموں سے، تم لوگوں کے لئے معافی کی، سفارش کر دوں گا۔ ممکن ہے وہ تم لوگوں کو معاف کر دیں۔ مگر یہ سُن لو کہ جو چیز آسمان سے ایک دفعہ یہاں اتر آتی ہے وہ پھر کسی حالت میں بھی، آسمان کی بلندیوں پر واپس نہیں بلائی جاتی۔"

سورج نے چندا ماموں سے ان ستاروں کی سفارش کی اور کہا کہ دیکھو، چھوٹوں کی غلطیوں کو معاف کر دینا چاہیئے۔ کافی کہنے سننے کے بعد چندا ماموں راضی ہوئے۔ انہوں نے سورج سے کہا کہ آپ میرے بزرگ ہیں۔ میں آپ کا کہنا نہیں ٹال سکتا آپ کا کہنا میرے لئے حکم کے برابر ہے۔ ان ستاروں کو آسمان پر دوبارہ بلا لینا تو ممکن نہیں۔ ہاں ان کی سزا میں کسی قدر کمی کی جا سکتی ہے۔

دوسرے دن جیسے ہی سورج نے آسمان پر اپنی چمک دمک دکھائی، نیم جان تاروں نے ان سے اپنے بارے میں پوچھا۔ سورج نے چندا ماموں کی پوری بات کہہ سنائی۔ ان کی بات سُن کر ستارے رونے لگے۔ سورج نے انہیں سمجھایا کہ تم لوگ اب دنیا میں رہ کر اچھے کام کرو۔ دوسروں کی خدمت اپنا مقصد بنالو۔ بہت ممکن ہے، تمہاری خدمت اور نیک کاموں سے خوش ہوکر، آسمانی مخلوق اپنے اصولوں کو کسی قدر بدل لینے پر آمادہ ہو جائے۔ اور تمہیں واپس بلانے کا کوئی راستہ نکل آئے۔ چندا ماموں کا اور میرا خیال ہے کہ تم لوگوں کو چنبیلی کے پھول بنا دیا جائے۔ اب تم میں ذرا سی بھی چمک دمک اور رنگ و بو نہیں ہے۔ تم جب چنبیلی کے پھول بن جاؤ گے تو دنیا والے تمہیں دیکھ کر خوش ہوں گے۔ تم اپنی مہک اور خوبصورتی سے انہیں خوش کرتے رہنا۔ دوسروں کی، جہاں تک ممکن ہو، بھلائی کرنا۔ تمہارے

اچھے کاموں سے، چندا ماموں تم لوگوں سے ضرور خوش ہو جائیں گے۔

ستاروں کو مجبوراً اس فیصلے پر راضی ہونا پڑا۔

انہیں چنبیلی کے پھول بنا دیا گیا۔ وہ دن ہے اور آج کا دن، وہ ستارے اپنی خوبصورتی، دل فریبی اور خوشبو سے انسان کا دل موہ رہے ہیں۔ وہ اِسی انتظار میں ہیں کہ شاید آسمان پر دوبارہ جانے اور ستارے بننے کی ان کی آرزو پوری ہو جائے۔

یہ کہانی سُن کر ننھّی کچھ دیر تک چپ رہی۔ اس نے تکیے کے پاس پڑے ہوئے پھولوں کو اٹھا کر بڑے غور سے دیکھا۔ اس کی ننھّی منّی نازک سی آنکھوں میں موتی لرزنے لگے۔ وہ چپ چاپ میرے بستر سے اٹھی۔

"ننھّی کیا سونے جا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

ننھّی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ چپ چاپ

اپنی بجیا کے بستر کے نزدیک جا کر کھڑی ہو گئی۔
"کہیئے، اس وقت کس لئے تشریف لائی ہیں؟" بجیا نے ناراضگی سے پوچھا۔

ننھیّ، بغیر کچھ کہے ان سے لپٹ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ رو ہانسی آواز میں بولی۔ "بجّیا، ہمیں معاف کر دو اب ہم ہمیشہ، آپ کا کہنا مانیں گے۔ آپ کا ہر کام، فوراً کر دیا کریں گے۔" آنسو اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔ بجیا نے اسے چمٹا لیا۔ خوب ہی پیار کیا۔ " ارے، ارے، یہ کیا؟ تم تو رو رہی ہو۔ ہماری ننھیّ تو بڑی اچھی ہے۔ میں بھلا اتنی پیاری سی بہن سے ناراض ہو سکتی ہوں؟" بجیا برابر اسے پیار کئے جا رہی تھیں۔

میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا مسکرا رہا تھا۔ اور میرے نزدیک تکیے کے پاس پڑے ہوئے چنبیلی کے پھول مہک مہک کر اپنی بھینی بھینی خوشبو سے ساری فضا کو معطّر کر رہے تھے۔

سچ کی جیت

شاہی دربار لگا ہوا تھا۔ مگر یہ دربار دوسرے شاہی درباروں سے مختلف تھا۔ حاکمِ وقت سونے چاندی کے قیمتی تخت کے بجائے ایک مسجد کے صحن میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے بیٹھنے کی جگہ تھوڑی سی اونچی تھی۔ جسے چبوترہ کہا جا سکتا تھا۔ یہ حاکم عام لوگوں کی طرح سادے لباس میں تھا۔ اس میں دوسرے بادشاہوں جیسی شان و شوکت بالکل نہ تھی۔ اس کے باوجود اس کے چہرے کا رعب اور دربار کی سادگی لوگوں پر خوف اور ہیبت طاری کر دیتی تھی۔

ایک جنگی مجرم کو اس کے دربار میں پیش کیا گیا۔ یہ مجرم ایک ایرانی سپہ سالار تھا جو کافی خون خرابے کے بعد بڑی مشکل سے گرفتار ہوا تھا۔ اسے گرفتار کرنیوالے سپاہیوں نے اسکے سارے کرتوت اس حاکم کو بتلائے۔

"اچھا تو یہ وہی بدبخت ہے جس نے مسلمانوں کے سکون کو پارہ پارہ کر رکھا تھا، اور اس نے اسلام اور مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔" بادشاہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، پھر اس سے مخاطب ہو کر پوچھا:

"اے مفسد! تم جانتے ہو کہ تمہیں اس جرم کی کیا سزا ملتی ہے؟"

مجرم خاموش کھڑا رہا۔

"سنو! ہم یہ جنگیں اپنی ذات یا کسی شخصی اقتدار کے لئے نہیں لڑ رہے ہیں بلکہ یہ تمام جنگیں صرف اسلام کے لئے لڑی جا رہی ہیں تاکہ اس دین حق

کی روشنی کو دنیا کے کونے کونے میں پھیلا دیا جائے اور دنیا سے تمام برائیوں کو ختم کر کے اسلامی تعلیمات کی روشنی سے ساری دنیا کو منوّر کر دیا جائے حاکم نے کہا

تمام لوگ نہایت خاموشی سے یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔

"یوں تو تمہاری سزا موت ہے، لیکن یہ سب کچھ چونکہ اسلام کے لئے ہم کر رہے ہیں۔ لہذا تم اگر اب بھی اسلام قبول کر لو تو تمہاری یہ سزا ختم ہو سکتی ہے۔ بولو! کیا تمہیں یہ منظور ہے؟"

مجرم نے یہ سن کر برا سا منہ بنایا اور پہلے کی طرح خاموش رہا۔

"کیا تمہیں مسلمان ہونا منظور ہے؟" حاکم نے اس سے دوبارہ پوچھا۔

مجرم گردن اکڑائے اسی طرح کھڑا رہا۔ اس نے جواب نہ دیا۔ اس سے تیسری بار بھی دریافت

کیا گیا، مگر اس نے مسلمان ہونے کے لئے اپنی رضامندی ظاہر نہ کی۔

"اگر تمہیں یہ شرط منظور نہیں تو پھر اپنی موت کے لئے تیار ہو جاؤ"۔ حاکم نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

جلاّد حکم پاتے ہی مجرم کی طرف بڑھا تاکہ مسجد سے باہر لے جا کر اُس کا کام تمام کر دیا جائے۔ مجرم اپنا یہ انجام دیکھ کر لرز اٹھا۔ اب موت اس کی نظروں کے سامنے کھڑی ناچ رہی تھی۔

"ذرا ٹھہرو!" مجرم نے کپکپاتے ہوئے ہاتھ سے جلاّد کو اشارہ کیا۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے اٹک اٹک کر حاکم سے کہا:

"حضور، آپ مجھے سزا ضرور دیں، مگر قتل کئے جانے سے پہلے مجھے تھوڑا سا پانی تو پلوا دیں۔ اس وقت مجھے سخت پیاس لگی ہے"۔ حاکم نے جلاّد کو اشارے سے روکا اور فرمایا۔

"ٹھیک ہے، اس کی آخری خواہش پوری کی جائے"۔

مجرم کو پانی کا گلاس لا کر دیا گیا۔ بڑی مشکل سے وہ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے گلاس کو منہ تک لے گیا۔ اس کا گلا پیاس سے بالکل سوکھا ہوا تھا، مگر موت کا خوف اس پر اس بری طرح سے طاری تھا کہ اپنی پوری کوشش کے باوجود وہ پانی نہ پی سکا۔

حاکم نے نہایت نرم لہجے میں اس سے کہا۔

"تم اطمینان سے پانی پی لو۔ خوب اچھی طرح اپنی پیاس بجھا لو۔ تمہیں اس وقت تک قتل نہیں کیا جائے گا، جب تک اس گلاس کا سارا پانی تم پی نہ لو گے۔ تم سے ہم یہ وعدہ کرتے ہیں۔"

یہ سن کر مجرم لمحہ بھر سوچتا رہا۔ پھر اس نے گلاس کا سارا پانی زمین پر انڈیل دیا۔ زمین کچی اور خشک تھی۔ پانی فوراً زمین میں جذب ہو گیا۔

مجرم ایک پھیکی سی مسکراہٹ اپنے خشک ہونٹوں پر لاتے ہوئے بولا:

"حضور! آپ نے فرمایا تھا کہ آپ اس وقت تک مجھے قتل نہیں کرائیں گے جب تک کہ میں اس گلاس کا سارا پانی پی نہ لوں۔ اب اس گلاس میں وہ پانی نہیں ہے، جسے مجھے پینا ہے۔ وہ مٹی میں جذب ہو چکا ہے۔ میں اسے جب تک پی نہ لوں، آپ کے وعدہ کے مطابق مجھے قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اب میرا قتل ناممکن ہے، آپ کے پاس اقتدار ہے۔ اب بھی آپ اس مجبور قیدی کو قتل کرا سکتے ہیں۔ مگر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ ایک سچّے انسان ہیں اور اپنے قول کا پاس کرتے ہیں۔"

حاکم نے حیرت سے مجرم کی طرف دیکھا اور کچھ دیر تک سوچنے کے بعد کہا:

"اے عجمی سپہ سالار! تم صرف دلیر ہی نہیں بلکہ ذہین بھی ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ تم ہمارے کھلے دشمن ہو، تمہیں چھوڑ دینا اور معاف کر دینا دانشمندی

نہیں ہے مگر تمہارے قتل سے کہیں زیادہ عزیز
ہمیں اپنا یہ وعدہ ہے۔ بہرحال ہم اپنے وعدے
سے کسی طرح بھی نہیں پھریں گے۔ جاؤ تم اب
آزاد ہو۔ جدھر جی میں آئے چلے جاؤ۔"

یہ فیصلہ سُن کر مجرم ہکّا بکّا رہ گیا۔ اور پھر
دوسرے ہی لمحے بزرگ حاکم کے قدموں میں گر
گیا۔ اس نے کہا۔

"حضور! میں آپ کی طاقت اور قوّت سے نہیں
ہارا۔ مگر آپ کے وعدے کی سچائی نے مجھے شکست
دے دی ہے۔ میں اب اپنی ہار کو تسلیم کرتا ہوں
اور سچّے دل سے مسلمان ہوتا ہوں۔" کیا آپ جانتے
ہیں یہ فیصلہ کرنے والے عظیم بزرگ اور حاکم کون تھے؟
یہ دنیا کے عظیم انسان، ہمارے مشہور خلیفہ دوم حضرت
عمرؓ ابن خطاب تھے جو اپنی سچائی، انصاف اور بہادری
کی وجہ سے رہتی دنیا تک یاد کئے جاتے رہیں گے۔

عقل کی بات

یہ قصّہ اس زمانے کا ہے جب ہماری دنیا پر بسنے والے انسانوں نے ترقی نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ لوگ اس زمانے میں ننگے پاؤں چلا کرتے تھے۔ آج جو چیزیں ہمیں نہایت معمولی نظر آتی ہیں وہ اس زمانے کے لوگوں کے وہم وگمان میں بھی نہ تھیں۔

یہ واقعہ اُسی زمانے کے ایک بادشاہ کا ہے اس بادشاہ کی ملکہ بے حد خوب صورت تھی۔ بادشاہ اپنی ملکہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اس کی معمولی سے معمولی تکلیف بھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔

ایک دن وہ بادشاہ اپنی ملکہ کے ساتھ اپنے محل کے خوبصورت باغ میں سیر کر رہا تھا۔ ٹہلتے ٹہلتے اچانک ملکہ کی چیخ نکل گئی۔ چیخ کے ساتھ ہی وہ اپنے پاؤں کی طرف جھکی۔ بادشاہ گھبرا اٹھا۔ وہ بھی پریشان ہو کر ملکہ کے پاؤں کی طرف دیکھنے لگا۔

ملکہ کے خوبصورت اور نازک پاؤں کو ایک کانٹے نے زخمی کر دیا تھا۔ سارے محل میں کہرام مچ گیا۔ وزیر و حکیم غرض کہ محل کا ہر کوئی بھاگا بھاگا پھر رہا تھا۔ بہرحال ملکہ کے زخمی پاؤں کی مرہم پٹی کی گئی۔ بادشاہ سخت غصے میں تھا اس نے ارادہ کیا کہ باغ میں کام کرنے والے مالیوں اور صفائی کرنے والے ملازموں کو نوکری سے نکال دیا جائے اور انہیں سخت سزا بھی دی جائے۔

بادشاہ نے اپنے وزیروں، امیروں اور دوسرے درباریوں کو بلایا۔ وہ غصے کے مارے کانپ رہا تھا، اور دربار کے لوگوں پر ڈر اور خوف سے کپکپی چڑھی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے سخت ناراضگی کے عالم میں کہا:

"کیا ان مالیوں اور صفائی کرنے والوں کی فوج در فوج کو میں نے محض اس لیۓ جمع کیا تھا کہ وہ ہماری دی ہوئی تنخواہ سے عیش کرتے رہیں اور باغ کی ٹھیک ٹھیک دیکھ بھال اور صفائی نہ کریں۔ باغ میں کانٹے اِدھر اُدھر پھیلے رہیں اور یہاں دھول اور گرد اڑتی رہے؟"

پھر اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے بولا: "میں ان لوگوں کو کسی طرح بھی معاف نہیں کر سکتا۔ ان کی صرف سستی اور غفلت کی وجہ سے ملکہ کے پاؤں میں کانٹا چبھا ہے، جس کی تکلیف سے وہ تڑپ رہی ہیں۔"

غصے سے زمین پر پاؤں پٹختے ہوئے بادشاہ بولا: "جس وقت ملکہ کے پاؤں میں کانٹا چبھا تھا۔ اس وقت میں نے یہ بھی دیکھا کہ ملکہ کے پھول جیسے حسین اور نازک پاؤں پر دھول بھی جمی ہوئی تھی۔ اسی دھول اور گرد میں کانٹے چھپے رہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ملک میں کہیں بھی دھول اور

گرد رہے ، کیونکہ یہی دھول اور گرد اس مصیبت کی اصل جڑ ہے۔ دھول رہے گی تو کانٹے بھی اس میں چھپے رہیں گے اور آئندہ بھی اس قسم کے خطرناک حادثے ہوتے رہیں گے۔ میں نے آپ لوگوں کو اس لئے بلایا ہے کہ کوئی ایسی ترکیب سوچیں کہ جس سے دھول اور گرد بالکل نہ رہے اور اس طرح کانٹوں کا ڈر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے ۔ اب بادشاہ نے اپنے وزیراعظم کی طرف دیکھا اور کہا :

"آپ پورے دربار میں سب سے زیادہ بزرگ اور سمجھدار ہیں۔ مجھے فوراً کوئی ایسی تدبیر بتایئں جس سے آئندہ ایسا حادثہ رونما نہ ہو اور دھول گرد بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔"

وزیراعظم گھبرا گیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا:

"بادشاہ سلامت! یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ مگر ہم لوگوں کو ایک دن کی مہلت دی

جائے تاکہ اس مسئلے پر ہم لوگ اچھی طرح سوچ بچار کر سکیں اور آپس میں صلاح و مشورے کے بعد کوئی ایسی ترکیب نکالیں کہ آئندہ دھول اور گرد کی مصیبت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے۔ اور ہمیں اس قسم کے خطرناک حادثوں سے دوچار ہونے کی نوبت نہ آئے۔"

بادشاہ نے وزیر کی درخواست منظور کرتے ہوئے کہا :

"ٹھیک ہے، آپ لوگوں کو کل تک کی مہلت دی جاتی ہے۔" اس کے بعد دربار برخاست ہو گیا۔ تمام وزراء، امراء اور دوسرے درباری رات بھر پریشان رہے۔ سب لوگوں کو اپنی زندگیاں خطرے میں نظر آرہی تھیں۔ کون جانے کل بادشاہ کس کو کیا سزا دے؟ کون کون موت کے گھاٹ اتار دیے جائیں؟ یوں لگتا تھا جیسے تمام گھروں میں ماتم بپا ہو۔ ہر شخص سوچ بچار میں تھا کہ کوئی

ایسی ترکیب نکالی جاتے جس سے یہ بلا ہمیشہ کے لئے ٹل جائے۔

دوسرے دن جب دربار لگا تو بادشاہ نے وزیر اعظم سے پوچھا:

"کیا آپ نے کوئی ایسی تدبیر سوچی ہے، جس سے اس مصیبت سے چھٹکارا مل سکے؟" وزیر اعظم مسکرا کر بولا:

"جی ہاں، حضور! دنیا میں بھلا ایسی کون سی بات ہے، جسے حل نہ کیا جا سکے۔ ہم نے اس الجھن کا حل ڈھونڈھ نکالا ہے۔ آپ کا دربار پڑھے لکھے اور عقل مند لوگوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہاں بھنگی، چمار اور جاہل تو جمع نہیں ہیں کہ اتنی معمولی مشکل کا حل بھی پیش نہ کر سکیں۔ کل ہم لوگوں نے اس مسئلہ پر خوب غور کیا اور اس کا حل نکال لیا۔"

بادشاہ نے بے تابی سے پوچھا:

"جلدی بتائیے۔ ہمیں آپ اور اپنے دوسرے

سمجھدار اور عقلمند درباریوں سے یہی اُمید تھی۔ واقعی دنیا میں کوئی ایسی مشکل بات نہیں ہے جسے آپ جیسے عقلمند اور دانا لوگ حل نہ کر سکیں!

وزیراعظم نے عرض کی:

"بادشاہ سلامت! یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ کانٹوں اور گرد و غبار سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ سارے ملک میں خوب اچھی طرح جھاڑو دی جائے۔ جھاڑو دینے سے گرد و غبار، دھول اور اس کے ساتھ ساتھ تمام کانٹے ختم ہو جائیں گے۔ میں نے اس کام کے لئے ملک کے تمام بھنگیوں اور کوڑا کرکٹ اٹھانے والوں کو حکم دے دیا ہے کہ وہ آج سے یہ کام شروع کر دیں اور گرد و غبار اور کانٹوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیں۔"

وزیراعظم کی سوجھ بوجھ اور عقل مندی کی یہ باتیں سُن کر تمام درباری خوشی سے تالیاں بجانے لگے۔ بادشاہ بھی کسی قدر مطمئن نظر آنے لگا۔

وزیرِ اعظم کے حکم سے ملک کے سب بھنگی ہر طرف جھاڑو دینے لگے۔ ان کے علاوہ ہزاروں دوسرے لوگوں کو بھی اس کام پر لگا دیا گیا تاکہ ملک کا کونا کونا صاف ہو جائے اور اس طرح دھول اور گرد کے ساتھ ساتھ کانٹے بھی ختم کر دیے جائیں۔

اس جھاڑو لگانے کے کام کو شروع ہوتے ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ ہر طرف دھول ہی، دھول اُڑنے لگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے گرد و غبار اور دھول کی ایک چادر سی سارے ملک پر تن گئی ہو۔ بادشاہ یہ حال دیکھ کر اور آگ بگولا ہو گیا۔

"بند کرو یہ کام"، بادشاہ دھاڑا۔

بادشاہ کو غصّے میں دیکھ کر وزراء، امراء اور دوسرے تمام درباری کانپنے لگے۔ بادشاہ نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا۔ "نالائقو! یہ تم نے کیا کیا؟ مٹّی

اور گرد سے ہمارا دم گھٹا جا رہا ہے۔ ہر جگہ دھول ہو گئی ہے۔ کم بختو! یہ تم نے کیسی ترکیب سوچی ہے۔ مصیبت ختم ہونے کی بجائے اور بڑھ گئی ہے۔"

وزیر اعظم ہاتھ جوڑ کر بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اور اس نے کہا۔" حضور! ایک دن کی مہلت اور دیجیے۔ اب ہم ضرور کوئی نہ کوئی اچھا راستہ نکال لیں گے۔"

وزیر کے گڑ گڑانے پر بادشاہ کو رحم آگیا۔ اس نے کہا۔ "ٹھیک ہے، آپ لوگوں کو ایک دن کی اور مہلت دی جاتی ہے۔ کل تک آپ لوگ کوئی کار آمد ترکیب سوچ لیں، ورنہ اچھا نہ ہو گا۔"

اگلے دن پھر دربار لگا۔ اب سب وزیر، امیر اور دوسرے درباری بہت زیادہ خوش نظر آ رہے تھے۔ بادشاہ کے دریافت کرنے پر وزیر اعظم با ادب ہو کر بولا: " حضور، کل کی غلطی معاف کر دیجیے۔ ہم لوگ

اپنی کل کی بھول پر بے حد شرمندہ ہیں۔ آج ہم نے ایک دوسری ترکیب سوچی ہے۔ یہ ترکیب نہایت کارگر اور مفید ہے۔ ہمیں پوری اُمید ہے کہ اس ترکیب سے مسئلہ ضرور حل ہو جائے گا۔ اس بار ہمیں کسی طرح بھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑے گا"۔ تمام درباریوں کی نظریں وزیرِاعظم پر لگی ہوئی تھیں۔

بادشاہ کا مزاج بگڑا ہوا تھا۔ اس نے حکم دیا۔ "یہ ترکیب فوراً بتائی جائے"۔ وزیرِاعظم نے کہنا شروع کیا "حضور، مجھے اور دربار کے دوسرے وزیر، عالم فاضل اور عقل مند لوگوں کو بے حد شرمندگی ہے کہ ہماری پچھلی ترکیب سے، دھول اور گرد سے نجات ملنے کے بجائے، آپ کو اور رعایا کو اور بھی زیادہ تکلیف ہوئی۔ مگر اس وقت مجھے یہ بتاتے ہوئے بے حد مسرّت ہو رہی ہے کہ ہماری اس نئی تدبیر سے آپ کو اور رعایا کو اس روز روز کی مصیبت

سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔ اب ہم
نے سوچا ہے کہ ملک کے کونے کونے اور
چپّے چپّے پر خوب چھڑکاؤ کرایا جائے۔ اس سے
یہ فائدہ ہوگا کہ سب گردوغبار بیٹھ جائے گا۔
گردوغبار کے بیٹھنے سے تمام کانٹے اوپر آجائیں گے
جن کو چُن چُن کر دور کہیں پھینک دیا جائے گا۔
اس کے نتیجے میں نہ تو پاؤں گردوغبار سے گندے
ہوں گے اور نہ ہی کوئی کانٹا پاؤں میں چبھ سکے گا"

تمام درباری اس کی ترکیب سُن کر بہت خوش
ہوئے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ واقعی وزیرِاعظم باتدبیر
کی اس ترکیب سے دھول اور گرد نام کی کوئی چیز نہ
رہے گی۔ کانٹے ابھر آئیں گے، اور اس طرح ان
سب کو چن کر راستوں کو صاف کرنا آسان ہو جائے
گا۔ اور یوں اس مصیبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے
نجات مل جائے گی۔

بس پھر کیا تھا، ملک کے تمام سقّوں کو حکم دے

دیا گیا کہ ہر گلی کوچے اور ہر جگہ پانی چھڑکا جائے۔ ملک کے لاکھوں سقّوں نے اپنی مشکوں کا منہ کھول دیا، ہر طرف اتنا پانی چھڑکا گیا کہ ندی نالوں کا سا سماں ہو گیا۔ جدھر نظر اٹھتی، ادھر پانی ہی پانی اور کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ جاڑوں کا موسم تھا۔ اس چھڑکاؤ کے بعد یوں لگ رہا تھا جیسے ہر طرف سیلاب آگیا ہو۔ اس سے سردی کی سخت لہر دوڑ گئی اور لوگ سردی سے کانپنے لگے۔

اس ترکیب کا نتیجہ دیکھنے بادشاہ اور ملکہ سیر کو نکلے مگر کیچڑ میں ان کے لئے دشوار ہو گیا۔ ان کے پاؤں کیچڑ میں لت پت ہو گئے۔ اب تو بادشاہ کو اور بھی زیادہ غصّہ آیا۔ وہ غصّے میں دہاڑا! "نالائقو! نمک حرامو! کیا اسی دن کے لئے میں نے تمہیں پالا تھا؟ کیا اسی لئے تم کو اتنی بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی رہی ہیں؟ تم سب بڑے بڑے عالم، فاضل اور عقل مند بنے پھرتے ہو، لیکن تم سب مل کر بھی

اس معمولی سی مشکل کو دور نہیں کر پائے۔ اب میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تم سب نااہل اور ناکارہ ہو۔ اس مسئلے کو حل کرنا تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔"

سب درباری گڑگڑاتے "حضور! انہیں ایک موقع اور دے دیجئے۔ اس بار اس مسئلے کا کچھ نہ کچھ حل یہ ضرور نکال لیں گے۔"

سب وزیروں، امیروں اور درباریوں کے، بری طرح گڑگڑاتے اور رونے دھونے پر بادشاہ نے انہیں ایک موقع اور دے دیا۔

اب یہ کوئی ڈھکا چھپا معاملہ نہیں رہا تھا۔ ملک کے بچے بچے کو اس کی خبر ہو چکی تھی۔

دوسرے دن پھر دربار لگا۔ اس بار اس وزیر نے یہ تدبیر بتائی کہ ہر جگہ فرش بچھا دیا جائے۔ فرش بچھانے سے پاؤں کو دھول نہ لگے گی اور پاؤں گندے نہ ہوں گے۔ کانٹے لگنے کا خطرہ بھی نہ رہے گا۔

بادشاہ نے یہ تجویز منظور کرلی اور فرش بچھانے کا کام شروع ہوگیا۔ بادشاہ کے محل اور باغ غرض کہ ہر جگہ فرش بچھائے جانے لگے۔ مگر اتنا بچھانے کا سامان کہاں تھا کہ ملک کی ساری زمین کو فرشوں سے ڈھانپ دیا جاتا۔ بادشاہ اس تدبیر کی ناکامی پر پاؤں پٹخ رہا تھا۔ اس نے کہا: "یہ ٹھیک ہے، تم نے میرے محل اور باغوں میں فرش بچھوا دیئے ہیں۔ خاص خاص جگہوں اور راستوں پر بھی فرش ہیں۔ مگر مجھے تو جگہ جگہ جانا پڑتا ہے۔ دور دراز علاقوں میں اپنی رعایا سے ملنا پڑتا ہے تاکہ ان کی تکلیف اور پریشانی کا مجھے پتہ چلے۔ جب میں ان سے ملنے عام راستوں اور جگہوں پر جاؤں گا تو کس طرح خاک، دھول، گرد و غبار اور کانٹوں سے بچ سکوں گا۔ نہیں، نہیں، یہ ترکیب بھی پہلے کی طرح بالکل بے کار ہے۔ تم لوگ اس معمولی سے مسئلے کو حل کرنے میں قطعی طور پر ناکام ہو چکے ہو۔ اب میں تم لوگوں کو ایسی

سخت سزا دوں گا کہ ہمیشہ یاد رکھوگے۔"

بادشاہ غصّے سے پاگل ہوا جارہا تھا۔ اسی وقت دربار کا ایک خاص محافظ اندر آیا اور اس نے بادشاہ سے کہا "حضور! ایک شخص آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ خود کو چمار بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں حضور کو اس مصیبت سے چھٹکارا دلا سکتا ہوں۔ اس کا دعویٰ ہے کہ حضور کے اس مسئلے کا حل اس کے پاس موجود ہے۔"

بادشاہ نے اسے اندر آنے اور پیش ہونے کی اجازت دے دی۔ اُسے دربار میں حاضر کیا گیا۔ بڑا غریب اور مسکین سا آدمی تھا۔ اس کے پھٹے پرانے کپڑے اور خستہ حالت دیکھ کر اور یہ جان کر کہ وہ ذات کا چمار ہے، ان پڑھ اور جاہل ہے، تمام امیر، وزیر اور دوسرے درباری اپنی پریشانی کو بھول کر ہنسنے لگے۔ وہ آپس میں کہہ رہے تھے کہ یہ جاہل اور ان پڑھ چمار اتنے بڑے مسئلے

کو کیسے حل کرے گا جو ہم جیسے سمجھدار، عقل مند اور بڑے لوگوں سے حل نہ ہو سکا۔

چمار نے بادشاہ کو سلام کیا اور کہا: "حضور! میرے پاس آپ کے مسئلے کا حل ہے۔ یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو کل تک میں آپ کی اس مصیبت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں گا۔"

بادشاہ غصّے میں تو تھا ہی۔ وہ چیخ کر بولا: "سب کم بخت یہی کہتے ہیں، مگر اس مسئلے کو حل کرنے میں قطعی ناکام رہے ہیں۔"

چمار کے پھٹے پرانے معمولی کپڑے اور اس کا حلیہ دیکھ کر بادشاہ نے سوچا کہ یہ ان پڑھ اور جاہل گنوار کس طرح اس مشکل کو حل کرے گا۔ یونہی وقت خراب کرنے آگیا ہے۔ یہ سوچ کر بادشاہ کو اور بھی غصہ آیا۔ اس نے طیش میں آکر کہا: "اے بیچ شخص! تو نے ہمارے دربار میں آکر سخت غلطی

اور گستاخی کی ہے۔ اگر تو نے کل تک ایسی کوئی ترکیب نہ بتائی جس سے یہ مسئلہ حل ہو جائے تو تیری جان کی خیر نہیں۔" پھر بادشاہ اپنے محافظوں سے مخاطب ہوا اور ان سے کہا:

"لے جاؤ، اسے یہاں سے اور کل تک کے لئے اسے قید کر دو۔ اسے کل ہمارے سامنے حاضر کیا جائے۔ اگر کل، یہ کوئی مناسب ترکیب بتانے میں ناکام رہا، تو بھرے دربار میں اس کا سر تلوار سے اڑا دیا جائے گا۔"

یہ حکم سن کر تمام درباری سناٹے میں آ گئے۔ مگر وہ چمار ذرا بھی نہ گھبرایا۔ سپاہی اُسے گرفتار کرنے کے لئے بڑھے تو اس نے اُس سے کہا۔

"ٹھہرو! مجھے ذرا دو منٹ کی مہلت دو۔"

وہ بادشاہ کے پاس گیا اور جھک کر اس کے پاؤں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ لوگ یہ سمجھے کہ شاید وہ بادشاہ کے قدموں پر گر کر اپنے کئے کی معافی

مانگ رہا ہے اور اپنی جان بخشی کی درخواست کر رہا ہے۔ لیکن چمار نے ان دو چار لمحوں میں، اچھی طرح سے، بادشاہ کے پاؤں کی لمبائی، چوڑائی اور موٹائی کا اندازہ لگا لیا۔ اس کے بعد سپاہی اُسے گرفتار کر کے لے گئے، اور جیل کی ایک کوٹھری میں اس کے تھیلے سمیت اسے بند کر دیا۔

سپاہیوں کے چلے جانے کے بعد، اس نے مسکراتے ہوئے، اپنے تھیلے سے عمدہ قسم کا چمڑا اور اپنے اوزار نکالے اور کام میں لگ گیا۔ تمام دن اور تمام رات، وہ بڑی محنت اور دلچسپی سے اپنے کام میں لگا رہا۔

دوسرے دن دربار میں اسے بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ ہر شخص کا خیال یہی تھا کہ اسے موت کی سزا دے دی جائے گی۔ بادشاہ نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا:

"اپنی وہ ترکیب فوراً بتاؤ۔ مگر یاد رکھو یہ ترکیب

اگر دوسروں کی طرح ناکامیاب رہی تو تمہیں موت سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔"

چمار نے مسکراتے ہوتے جواب دیا!

" حضور! میں ایک جاہل اور ان پڑھ مزدور ہوں، تاہم خدا نے مجھے تھوڑی سی عقل دی ہے اور میں اسی ملک میں رہتا ہوں۔ اس لئے میرا بھی یہ فرض ہے کہ میں اپنی عقل اور محنت سے اپنے ملک اور حکومت کی کچھ خدمت کروں اور وقت پڑنے پر کام آؤں۔"

تمام درباری حقارت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

چمار نے بڑے اطمینان سے کہا:

"حضور! میں نے آپ کے مسئلہ کا حل تلاش کر لیا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے جوتوں کی ایک نہایت خوبصورت جوڑی اپنے تھیلے سے نکالی اور بادشاہ کی طرف

بڑھا دی اور بادشاہ سے کہا:

"لائیے حضور! اپنے پاؤں ادھر لائیے۔ یہ جوتے ہیں جناب۔ میں انہیں آپ کے پاؤں میں پہنا دوں، اور جہاں کہیں، آپ کا جی چاہے جائیے۔ اب آپ کے پاؤں پر دھول یا گرد و غبار نہیں لگیں گے اور نہ ہی کوئی کانٹا اب آپ کے پاؤں کو زخمی کر سکے گا۔" بادشاہ نے جوتے پہن لئے۔ اسی وقت وہ آزمانے کے لئے باہر نکل گیا۔ اب واقعی اس کے پاؤں دھول اور گرد سے محفوظ تھے۔ بادشاہ کو یہ یقین بھی ہو گیا کہ ان جوتوں کی وجہ سے اب اس کے پاؤں میں کانٹا بھی نہ چبھ سکے گا۔

بادشاہ اب بہت خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ وہ بار بار چمار اور اس کے ایجاد کردہ جوتوں کو تعریف کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اور اس کے برخلاف تمام درباری اپنی بڑائی کے جھوٹے ڈھونگ اور اپنی ترکیبوں کی ناکامی پر شرمندہ نظر آ رہے تھے۔

عیدی

رمضان کے پورے مہینے روزے رکھنے والے روزہ دار بھی شاید اتنی بے تابی سے چاند کو آسمان پر نہ ڈھونڈھتے ہوں گے جتنی بے تابی سے پرویز، ننھّی چنّو، گڈّو اور پپّو چاند کی ایک جھلک پانے کے لئے شام ہی سے چھت پر نظر آ رہے تھے۔

چاند انتیس تاریخ ہی کو نکل آیا۔ اب کیا تھا۔ ہر گلی میں ڈھول اور نقارے پیٹے جا رہے تھے، گولے چھوڑے جا رہے تھے، سائرن بج بج کر، کل ہونے والی عید کی خوش خبری سُنا رہے تھے۔

ابھی کچھ ہی دن ہوئے کہ ایک دکان میں شیشے کی الماری میں چمچماتا ہوا کیرم بورڈ دیکھ کر پرویز اچھل پڑا تھا۔ چکنی اور چمکتی ہوئی چھوٹی چھوٹی سفید اور کالی گوٹیاں اور خوبصورت لال لال سی کوئین، اسے اب بھی یاد تھیں۔ اس کے ضد کرنے پر، اس کی امّی نے یہ کہہ کر اسے ٹال دیا تھا کہ عید قریب آ رہی ہے، اگر کیرم بورڈ تمہیں لینا ہی ہے تو اپنی عیدی کے پیسوں سے لے لینا۔ وہ بڑی بے تابی سے عیدی کا انتظار کر رہا تھا کہ عید آئے، عیدی ملے اور وہ کیرم بورڈ خرید سکے۔

آخر وہ دن آ ہی پہنچا۔ اسے بے انتہا خوشی تھی۔ اسے تین طرح کی خوشی مل رہی تھی یعنی عید کی، عیدی کی اور عیدی سے اپنی آرزو پوری کرنے کی۔

نماز کے بعد سڑکوں اور گلیوں میں بڑی گہما گہمی تھی۔ گھر گھر لوگ ایک دوسرے سے عید ملنے آجا رہے

تھے۔ سارا دن ملنے ملانے اور طرح طرح کے کھانے کھانے کا سلسلہ چلتا رہا۔

ارشد، سہیل، اعجاز، احمد اور دوسرے کئی دوست پرویز سے گلے ملتے اور عید کی مبارکباد دینے آئے مگر انور نہیں آیا۔ وہ اس کا سب سے زیادہ گہرا دوست تھا۔ پرویز نے سوچا کہ وہ پڑھنے میں لگا ہوگا۔ پھر وہ سوچنے لگا ایسا بھی پڑھنا کیا کہ عید کے مبارک موقع پر بھی دو چار منٹ کے لئے اپنے دوستوں سے نہ مل سکے۔ اسے یہ بات اچھی طرح یاد تھی کہ پچھلے سال اگر چار نمبر انور کے اور آجاتے تو اس کی فرسٹ پوزیشن نہ آتی۔

پرویز اور انور کا جماعت میں ہر سال مقابلہ رہتا تھا۔

وہ ان ہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس کے چھوٹے بہن بھائیوں نے اسے گھیر لیا۔ اور کہنے لگے "بھیا کیرم بورڈ نہیں لاؤ گے کیا؟ تم نے تو کہا تھا کہ عید کے دن ضرور لاؤں گا۔"

"ہاں ہاں، ابھی جاتا ہوں۔" وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ اس نے سوچا، چلو کیرم بورڈ لانے چلتے ہیں، اس طرح انور سے بھی ملاقات کر لوں گا اور اس کے نہ آنے کی وجہ بھی معلوم ہو جائے گی۔

"لاؤ بھئی، اپنے اپنے پیسے نکالو۔ پچیس روپے کا کیرم بورڈ آتا ہے۔ دس روپے میرے پاس ہیں۔"

بچوں نے خوشی خوشی اپنی اپنی عیدی کے پیسے پرویز کے حوالے کر دیے۔ اور وہ نکل پڑا۔ سیدھے سب سے پہلے وہ انور کے یہاں گیا۔ انور کے والد اور والدہ کو سلام کرنے کے بعد، پرویز تیزی سے انور کے کمرے میں پہنچا۔

"خوب! تم یہاں منہ چھپائے بیٹھے ہو۔ کیا پڑھتے پڑھتے تھک گئے ہو؟" پرویز طنزیہ انداز میں بولا۔

انور چپ رہا۔

"بولتے کیوں نہیں؟ کیا دوستی ہے تمہاری کہ آج عید کے دن بھی، دو چار منٹ نہیں نکال سکتے۔ یہی ہے

تمہاری دوستی !! یار، آخر ایسا بھی کیا پڑھنا!"
انور نے اداس نظروں سے اسے دیکھا۔
"بولو نا، استاد۔ بناؤ کوئی اچھا سا بہانہ۔ بہلنے بنانے میں تو تم بڑے ماہر ہو۔
انور کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ وہ کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا:
"پرویز اب اور زیادہ شرمندہ نہ کرو۔"
"آخر بتاؤ نا کیا بات ہے؟" اس کے آنسو دیکھ کر پرویز گھبرا سا گیا۔
"کوئی خاص بات نہیں۔" انور نے آنسو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ مگر آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔

"بولو نا کیا بات ہے؟ تم اس قدر آبدیدہ کیوں ہو گئے؟" پرویز نے پوچھا۔ مگر انور خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر ایک گہری اداسی چھائی ہوئی تھی اس کی یہ حالت دیکھ کر پرویز بھی بیتاب ہو گیا اور بار بار

اس سے اصرار کرنے لگا کہ وہ اپنی پریشانی کا راز بتائے۔ آخر انور کو مجبور ہو کر بولنا پڑا۔

"پرویز! میں اس بار امتحان میں نہ بیٹھ سکوں گا۔"
"بھئی، ایسی کون سی آفت آگئی کہ تم امتحان میں نہیں بیٹھ سکو گے۔" پرویز نے ہمدردی سے پوچھتے ہوتے کہا۔ "میرے پاس فیس کے پیسے نہیں ہیں اور پرسوں فیس جمع کرانے کی آخری تاریخ ہے۔" انور نے نظروں کو نیچے کرتے ہوئے کہا اور اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے بات کو جاری رکھا: "اباجی کو تم جانتے ہی ہو، کافی عرصے سے بیمار رہتے ہیں۔ اس ماہ ان کو صرف دس بارہ دن کی تنخواہ ملی تھی۔ ماموں جان کی طرف سے منی آرڈر آنے کی ایک اُمید تھی، لیکن اب تک اس کا انتظار ہی ہے۔ کوشش کے باوجود اباجی صرف دس روپے دے پائے ہیں۔ اب میں بہت پریشان ہوں کہ ساری محنت پر پانی پھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ اس فکر میں دل بیٹھا جا رہا ہے اور اسی وجہ سے میں تمہارے گھر تم سے ملنے

نہ جا سکا۔ خواہ مخواہ اپنی پریشانی سے تم کو بھی اداس کرتا۔" یہ کہتے ہوئے انور کے آنسو ڈھلک پڑے اور کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔

اداس انور ——— انور کی محنت، اس کا امتحان اور نتیجہ! اس کے بعد کیرم بورڈ کی چمکتی ہوئی گوٹیاں، خوبصورت لال لال کوئین، پچیس روپے، دس روپے، امّی اور انتظار کرتے ہوئے چھوٹے بہن بھائی ——— ان سارے سوچوں سے پرویز کا سر چکرا گیا۔ وہ سوچتا رہا۔ اس کے اندر ایک کش مکش جاری رہی۔ کبھی انور کی مدد کی سوچتا پھر کیرم بورڈ کا خیال آجاتا۔ بہر حال پرویز نے بیس روپے جیب سے نکالے اور انہیں میز پر رکھتے ہوئے کہا:

"بس، اتنی سی بات پر اداس ہو تم تو انور نرے بدّھو ہو! اس میں آخر، اس طرح پریشان ہونے کی کیا بات تھی؟ مجھ سے ہی کہہ دیا ہوتا۔ دوست اگر دوست کے کام نہ آئے تو دوستی ہی کیا؟ یہ لو روپے۔ دس

روپے اپنے پاس سے ڈال کر اپنی فیس جمع کرا دینا۔"

"نہیں، نہیں، پرویز! نہ جانے یہ روپے تم کس کام کے لئے لاتے ہو۔ تمہاری امّی نے شاید کچھ منگایا ہوگا۔ تم انہیں اپنے پاس ہی رکھو۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو؟ یہ پیسے تو میرے ہیں۔ آج ہی مجھے عیدی میں ملے ہیں۔ اگر کسی کام کے لئے بھی ہیں، تو کیا؟ کیا فیس جمع کرانا ضروری کام نہیں ہے؟" پرویز نے کہا۔

"نہیں، پرویز! میں تمہاری عیدی کے پیسے نہیں لوں گا۔" انور بولا۔ "آخر یہ جھجک کیوں؟ اس قدر غیریّت کیوں برتتے ہو؟ رکھ لو انہیں اپنے پاس۔ پرسوں فیس جمع کرا دینا۔" پرویز نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

انور کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔

پرویز جب گھر پہنچا تو اسے خالی ہاتھ دیکھ کر بچے پوچھنے لگے:

"کیرم کہاں ہے؟ کیرم کیوں نہیں لائے؟" بس گھر میں

ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔"کیوں، پیسے کہیں کھو آئے ہو؟"
امّی کی گرجدار آواز نے پرویز کے رہے سہے ہوش
بھی اڑا دیے۔

پرویز نے ڈرتے ڈرتے، ساری بات امّی کو کہہ
سنائی۔ وہ امّی کی ڈانٹ پھٹکار سننے کے لیے تو تیار
ہی تھا۔ کیا ہوا اگر امّی اس کی شکایت ابّا سے کر دیں گی؛
تھوڑی سی پٹائی ہی ہو جائے گی نا۔

امّی کا غصّہ آہستہ آہستہ رفع ہو گیا۔ ان کے
چہرے پر خوشی کی چمک آگئی۔ انہوں نے بڑھ کر پرویز
کو گلے سے لگا لیا۔

"میرے بیٹے! میرے لال! تو تو بہت ہی اچھا ہے۔
بیٹے، دوسروں کی مدد کرنا ہی پیسوں کا سب سے اچھا
استعمال ہے۔ دوستی کا دوسرا نام قربانی بھی ہے۔"

چھوٹے بچّے بڑی حیرت سے یہ تماشہ دیکھ رہے
تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

امّی تیزی سے اندر گئیں اور پچیس روپے لا کر پرویز

کو دیتے ہوئے کہا:

"لو، بیٹے! لو - ابھی جاؤ جا کر کیرم بورڈ لے آؤ - اپنی عیدی کے باقی پیسے اپنے پاس رکھو۔"

امّی کی یہ باتیں سُن کر، بچوں کے مرجھائے ہوئے چہرے ایک بار پھر خوشی سے کھل اٹھے۔

غرور کا سر نیچا

آج سے کئی سو سال پہلے ، ہندوستان میں بیجو نام کا ایک مشہور گویّا رہتا تھا۔ اسے جھوٹی شان و شوکت سے بڑی نفرت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آبادی سے دور جنگل میں رہا کرتا تھا۔ جہاں وہ اپنی لگن میں اپنے شاگردوں کو گانے بجانے کا درس دیا کرتا تھا۔ چونکہ وہ دنیا اور دنیا کے جھمیلوں سے الگ تھلگ رہتا تھا، اس لئے لوگ اسے باورا یعنی باؤلا (پاگل) سمجھتے تھے اور اُسے اسی نام سے پکارتے تھے۔

یوں تو بیجو باورے کے بے شمار شاگرد تھے، مگر ان میں گوپال نایک سب سے زیادہ لائق اور ہونہار شاگرد تھا۔ بیجو کو اپنے اس شاگرد سے بہت محبت تھی، اور وہ اسے بڑی لگن اور شوق سے موسیقی کی تعلیم دیتا تھا۔

دن رات کی محنت اور استاد کی نگاہِ خاص کی بدولت گوپال نایک سب کچھ سیکھ گیا اور جلد ہی موسیقی کی تعلیم مکمّل کرلی۔ اب وہ اس چاند کی طرح روشن تھا، جو سورج سے روشنی لے کر، پوری آب وتاب کے ساتھ جگمگا اٹھتا ہو۔

آخر کار، گوپال نایک کا استاد کے پاس سے جانے کا وقت آگیا۔ ایک استاد کو اپنے کسی لائق شاگرد سے جس طرح سچی، بے لوث اور بے غرض محبّت ہوتی ہے ویسی ہی محبت بیجو کو اپنے شاگرد گوپال نایک سے تھی۔ رخصت ہوتے وقت اس نے بھرائی ہوائی آواز میں گوپال سے کہا؛

بیٹا گوپال! میں نے اپنی زندگی بھر کی دولت تمہیں سونپ دی ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ خلوص اور ایمانداری سے اس کی حفاظت اور اپنی محنت سے اسے بڑھاتے بھی رہنا۔ بیٹا! علم ایک بہت بڑی طاقت بھی ہے۔ دیکھو! میری ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھنا، کبھی بھول کر بھی، اپنے علم کی طاقت کا، بے جا اور غلط استعمال نہ کرنا۔ یاد رکھو! لوگوں کو خوشی، مسّرت اور سکون پہنچانا ہی موسیقی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ بیٹے، میری ان باتوں کو کبھی فراموش نہ کرنا۔"

گوپال استاد سے دعائیں لے کر اور اپنے ساتھیوں کی نیک تمناؤں کے ساتھ، اپنے گھر کو واپس ہوا۔ اب اس کی نئی زندگی کا آغاز ہو رہا تھا۔ جلد ہی اس کی شہرت ہر طرف پھیلنے لگی اور چند ہی برسوں میں اس کے فن کی دھوم سارے ملک میں مچ گئی، یہاں تک کہ دلّی کے بادشاہ نے اسے اپنے دربار

میں بلا لیا۔ گوپال نایک نے شاہی دربار میں اپنے فن کے وہ کمالات دکھائے کہ بادشاہ اور اس کے درباری حیران رہ گئے۔ اس نے جلد ہی یہ ثابت کر دکھایا کہ ملک بھر میں اس کی ٹکر کا کوئی دوسرا گانے والا نہیں ہے۔ محنت اور لگن کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ تھوڑے ہی عرصے میں، وہ دربار کا سب سے بڑا گویّا اور موسیقی کا "شہنشاہ" کہلانے لگا۔

اس عزّت اور مرتبے کی وجہ سے گوپال نایک میں غرور پیدا ہو گیا، کیونکہ وہ فطرتاً اچھا آدمی نہ تھا۔ وہ اپنے مقابلے میں دوسروں کو ادنیٰ اور حقیر سمجھنے لگا۔ بات یہ ہے کہ علم ایک اچھے انسان میں عاجزی اور انکساری پیدا کرتا ہے اور برے انسان میں غرور اور گھمنڈ! گوپال کے اندر غرور اور گھمنڈ کی جڑیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ اب وہ یہ بات بھی کسی طرح برداشت نہ کر سکتا تھا کہ دربار میں اس کے علاوہ اور کوئی گویّا رہے۔ اس نے دوسرے

موسیقاروں سے مقابلے شروع کر دیے۔ مقابلوں کی شرط اس نے یہ رکھی کہ مقابلے میں جو ہارے اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ بادشاہ کو موسیقی کا بے حد شوق تھا اس لئے اسے یہ شرط پسند نہ تھی مگر گوپال اس شرط کے بغیر کسی سے مقابلے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے بے شمار موسیقاروں کی بیویاں، بیوہ اور بچے یتیم ہو گئے، مگر اس کے بے رحم دل میں گھمنڈ اور غرور کی جو آگ روشن ہو چکی تھی۔ وہ ٹھنڈی ہونے کا نام نہ لیتی تھی بلکہ اس کا گھمنڈ اور غرور روز بروز بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

ظلم کی یہ کہانی بیجو کے کانوں تک جا پہنچی۔ اسے یہ سن کر بڑا دکھ ہوا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس کا ہونہار اور لائق شاگرد اس قدر سنگ دل اور ظالم بن جائے گا۔

اور علم کی طاقت کا اس طرح غلط اور ناجائز استعمال کرے گا۔ اگرچہ بیجو اب بہت ہی بوڑھا اور کمزور ہو چکا تھا۔ پھر بھی اُس سے علم کی یہ توہین نہ دیکھی گئی۔ وہ اپنے بڑھاپے اور کمزوری کے باوجود دلّی شہر کی طرف چل پڑا تاکہ گوپال نایک کو سمجھا بجھا کر اور اپنی استادی کا واسطہ دے کر، سیدھے راستے پر لے آئے۔

وہ پوچھتا پاچھتا، موسیقی کے شہنشاہ، گوپال نایک کی حویلی تک جا پہنچا۔ اس نے گوپال کو پیغام بھجوایا کہ اس کا استاد بیجو اُس سے ملنے کے لئے آیا ہے۔ بار بار خبر بھجوانے کے بعد بڑی مشکل سے گوپال نے بیجو کو اندر اپنے پاس بلایا۔ بیجو باؤرا پہلے کی طرح پھٹے پرانے اور میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس حویلی میں استاد کا استقبال اور آؤ بھگت تو کجا، گوپال نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ کچھ دیر خاموش کھڑے رہنے

کے بعد، بیجو نے بڑے پیار سے کہا:

"بیٹا گوپال! تم نے مجھے پہچانا نہیں؟ میں تمہارا استاد بیجو ہوں۔ جس نے تمہیں کمال کے اس مقام تک پہنچایا ہے۔ اتنی دور سے پیدل چل کر صرف تم سے ملنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔"

استاد کی یہ بات سُن کر گوپال کو بہت غصّہ آیا۔ اس وقت اس کے پاس کئی درباری موجود تھے۔ ان کے سامنے وہ ایک بھکاری قسم کے آدمی کو اپنا استاد مان کر اپنی عزت اور شان کیسے مٹی میں ملا دیتا۔ اس نے بیجو کو ڈانٹ کر کہا:

"چپ رہ، او بڈھے! کیا بکتا ہے، تو اور میرا استاد! چل بھاگ یہاں سے۔"

بیجو نے خواب میں بھی اس کے اس برتاؤ کا تصوّر نہ کیا تھا۔ اس کے باوجود نہایت تحمّل سے اس نے کہا:

"گوپال! تجھے کیا ہو گیا ہے، بیٹا؟ میرا دیا ہوا علم کیا ہوا؟ تیری آنکھوں پر غرور اور گھمنڈ

کا پردہ کیوں پڑ گیا ہے ؟۔ تو اسے ہٹا کر مجھے دیکھ اور پہچان۔ تیرا استاد تیرے سامنے کھڑا ہے۔"

گوپال کا غصّہ اور بھی بھڑک اٹھا۔ وہ بڑی حقارت سے بولا: "میں تجھے پہچانوں یا نہ پہچانوں، مگر تو مجھے ضرور پہچان لے۔ میں نے بڑے بڑے استادوں کے سر جھکا دیے ہیں۔ تو کس کھیت کی مولی ہے۔ اگر تجھے اپنی استادی پر اتنا ہی ناز ہے تو کل، شاہی دربار میں آجانا۔ تیری استادی کا بھرم خود ہی کھل جائے گا۔ شاید تیری موت تجھے یہاں لے آئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بیجو کو دھکّے دلوا کر اپنی حویلی سے باہر نکلوا دیا۔ دوسرے دن بیجو شاہی دربار میں حاضر ہوا۔ اس نے یہ پیغام بھجوایا کہ گوالیار سے ایک گویّا شاہی گوّیے سے مقابلے کے لئے آیا ہے۔ بادشاہ نے اسے دربار میں بلوایا۔ تمام درباری اس کی خستہ حالت دیکھ کر ہنسنے لگے۔ خیر مقابلہ شروع ہوا۔

پہلے گوپال نایک کی باری آئی اس نے تان پورے
پر راگ چھیڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں راگ کے اثر
سے شاہی محل کے تمام چراغ از خود جل اٹھے۔
وہ گاتا گاتا رہا، پھر آس پاس کے جنگلوں سے
ہرن بھاگتے ہوئے اس کے پاس آکھڑے ہوئے۔
اس نے ان سب کے گلوں میں مالائیں پہنا دیں اور
راگ بندکر دیا۔ راگ کے بند ہوتے ہی پھر
تمام ہرن بھاگتے ہوتے جنگل میں چلے گئے۔

گوپال نایک نے بڑے گھمنڈ سے کہا:

"بوڑھے! دیکھا تو نے میری موسیقی اور گانے کا
کمال۔ اب اگر تجھ میں کچھ کمال ہے تو اپنی موسیقی
کے ذریعے ان ہرنوں کو واپس بلا کر، میری مالائیں،
ان کے گلوں سے اتار کر میرے حوالے کر دے۔"

بیجو باورا مسکرایا۔ اس کے بعد اس نے تان پورہ بجانا
اور گانا شروع کیا۔ بادشاہ اور سب درباری گانے
اور موسیقی کے اثر سے مست ہو گئے۔ نہ بجھے

ہوتے چراغ پھر سے جل اٹھے۔ ہرن جنگل سے واپس آگئے۔ بیجو بے خودی میں گاتا رہا، اور ہرنوں کی گردنوں سے مالائیں اتارتا رہا۔ انسان تو انسان، درخت اور در و دیوار بھی اس کی موسیقی کی تانیں اور دھنیں سن کر جھومنے لگے۔ گانے کے اثر سے محل کا پختہ فرش پگھلنے لگا۔ بیجو نے پگھلتے ہوئے پتھر کے فرش پر اپنا تان پورہ پھینک دیا۔ راگ کے رکتے ہی فرش پھر جم گیا اور تان پورہ اس میں پھنس کر رہ گیا۔

بیجو نے گوپال کو ہرنوں کی گردنوں سے اتاری مالائیں واپس کرتے ہوئے کہا:

"شاہی گویّے! میں نے تیری شرط پوری کر دی۔ اب اگر تیری موسیقی میں کچھ اثر ہے تو میرا تان پورہ اس پتھر کے فرش سے نکال کر مجھے دے دے۔"

گوپال نایک کو بادشاہ نے حکم دیا کہ وہ اپنے راگوں کے ذریعے تان پورہ پتھر کے فرش میں سے نکالے۔ گوپال نایک نے گانا شروع کیا۔ اس نے

لاکھ کوششیں کیں، قسم قسم کے راگ الاپے اور موسیقی کے تمام کمالات دکھا دیئے، مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ گاتے گاتے اس کا سانس پھول گیا۔ پھر اُس کے لرزتے ہوتے ہاتھوں سے اُس کا تان پورہ چھوٹ گیا اور اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ بادشاہ نے بیجو کے فتح مند ہونے کا اعلان کیا اور گوپال نایک کے قتل کا حکم دے دیا۔

گوپال نایک نے بادشاہ کا فیصلہ سنا تو گڑگڑا کر بولا :

"جہاں پناہ! یہ اس شخص کے فن کی نہیں بلکہ اس کے فریب کی جیت ہے۔ واقعی یہ میرا استاد ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ سکھلایا لیکن پتھر کو پگھلا دینے والا راگ نہیں سکھایا۔ اس نے ایک استاد کا فرض پورا نہیں کیا۔ اس کے اِسی فریب کی وجہ سے آج مجھے شرمندگی اٹھانی پڑی ہے۔ اس نے

مجھے دھوکا دیا ہے۔ اس نے اپنے ایک شاگرد کو دھوکا دیا ہے۔ ایسے دھوکے باز استاد کو سخت سے سخت سزا ملنی چاہیئے۔"

بیجو چند لمحے خاموش رہ کر بولا:

"او کم ظرف! میں نے بہت ہی اچھا کیا تھا کہ اس علم کو تجھ سے پوشیدہ رکھا۔ اگر میں اسے بھی تجھ جیسے کم ظرف انسان کو سکھا دیتا تو تیرے ہاتھوں میرا ہی نہیں اور بہت سے بے گناہوں کا یونہی خون ہوتا رہتا۔ آج اس فن کے راز کی بدولت میری جان بچی ہے اور اب دوسرے کئی بے گناہ موسیقاروں کی زندگیاں محفوظ ہوگئی ہیں۔"

گوپال نایک روتے ہوئے بیجو کے قدموں پر گر پڑا اور معافی مانگنے لگا۔ استاد پھر استاد ہوتا ہے۔ اس کی محبت اور شفقت جاگ اٹھی۔ اس نے بادشاہ سے گوپال کی جان بخشی کی درخواست کی۔

پھر اس نے بادشاہ سے کہا:

"عالی جاہ! استاد زندگی دیا کرتا ہے، زندگی لیا نہیں کرتا۔ میرا مقصد صرف اسے سیدھے راستے پر لانا تھا۔ اُمید ہے اب یہ ایک اچھا انسان بن جائے گا۔ اگر آپ واقعی اسے موت کی سزا دینا چاہتے ہیں تو اس کے بدلے مجھے موت کی سزا دے دیجیے میں گناہ گار ہوں۔ ایک استاد کی حیثیت سے یہ میرا فرض تھا کہ پہلے میں اس کی فطرت اور عادت پہچاننے کی کوشش کرتا۔ اس کے بعد اسے فن سے آگاہ کرتا۔ یہ میری غلطی تھی کہ میں نے اس غلط آدمی کو ایک بڑی قوّت اور طاقت حاصل کرنے کا موقع دیا۔ میری غلطی کی وجہ سے ہی اس کے ہاتھوں اتنے ظلم ہوتے۔ حضور! آپ اس شاگرد کو معاف کر دیں۔ اصل گناہ گار تو میں ہوں لہٰذا سزا مجھے ملنی چاہیئے۔"

بادشاہ نے کچھ سوچ کر جواب دیا:

"اے عظیم فنکار! تم پتھّر کو تو پگھلا سکتے ہو،

لیکن انصاف کرنے والے بادشاہ کے دل کو ناانصافی
کے لیئے نہیں پگھلا سکتے۔ انصاف اور اصول کی
خاطر اسے سزا ملنی ضروری ہے۔"
بیجو کی منت سماجت کے باوجود بادشاہ نے
گوپال نایک کا سر قلم کرا دینے کا حکم صادر فرما دیا۔
اس طرح اس معزور انسان کا سر تن سے جدا کر
دیا گیا۔

کنجوس

یہ پرانے وقتوں کے ایک کنجوس شخص کی کہانی ہے۔ کنجوسی کی بھی آخر، کوئی نہ کوئی حد ہوتی ہے مگر چنّو مل شاید اس بات سے آگاہ نہ تھا کہ کنجوسی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور کہاں پر ختم۔ اس نے کنجوسی کی تمام حدوں کو پار کر لیا تھا۔ اس کی اس بری عادت سے اس کے گھر والے بری طرح تنگ آچکے تھے۔ گھر میں اگر کوئی چراغ جلا لیتا تو وہ سارا گھر سر پہ اٹھا لیتا اور وہ بگڑتے ہوئے کہتا:

"دیوالی منا رکھی ہے، دیوالی۔ گھر میں چراغاں کیا جارہا ہے، چراغاں۔ جب چاندنی اتنی پھیلی ہوئی ہے تو چراغ جلانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا یونہی تیل جلاتے سے تم لوگوں کو مزہ آتا ہے؟"

اگر کبھی اس کا کوئی بیٹا کہتا:

"ابّا جان! آج رات اندھیری ہے۔ چاند بھی آسمان پر نہیں ہے۔"

یہ سن کر وہ آگ بگولا ہو جاتا اور یوں برس پڑتا:

"نادانو! آخر، فضول خرچی کی ایک حد ہوتی ہے اگر چاندنی نہیں ہے، تو کیا سڑک پر لگے کھمبوں کی روشنی بھی نہیں ہے۔ بدبختو! گھر کے تیل کو اس بیدردی سے ضائع کرنے پر کیوں تلے ہو۔ ذرا عقل سے کام لو۔ دیکھو! سارا صحن سڑک پر لگی ہوئی برقی روشنی میں نہایا ہوا ہے۔ تم سب اپنے کام کاج اسی روشنی میں کیوں نہیں کر لیتے؟"

"نہانے دھونے کے لئے ہر گھر میں پانی چاہئیے۔

اس کے لئے سقے کو پیسے دے کر پانی بھروایا جاتا ہے۔ اگر ہم اس پیسے کو بچائیں تو کسی اور کام آئے گا۔ اس کے لئے ہمیں خود محنت کرنی چاہیئے اور کنوئیں سے پانی بھر لانا چاہیئے تاکہ پانی کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔

چنّو مل بَلا کا سست اور کاہل تھا، لیکن گاہے گاہے کنوئیں سے تھوڑا پانی بھر کر ضرور لے آیا کرتا تھا۔ اگر اس کی محنت سے لائے ہوئے پانی سے کوئی بھولے بھٹکے ذرا نہا لیتا تو بس سمجھ لیجئے کہ قیامت آجاتی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر نہانا ہی ہے تو سال کے سال برسات کے دنوں میں خوب اچھی طرح روزانہ نہا لیا کرو۔ اس طرح نہا کر پورے سال کی کسر نکال لو۔ وہ کہتا، ہلدی لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔ خدا نے برسات کا موسم اسی وجہ سے تو بنایا ہے کہ گھر بیٹھے بٹھائے نہانے کا مزہ اٹھاؤ۔ اس کا اپنا طریقہ تو یہی تھا

کہ جہاں بارش شروع ہوئی وہ جھٹ جانگیہ نکالتا
اور نہانے لگتا۔ اس موسم میں وہ کسی بھی دن کی
بارش کو بے کار نہ جانے دیتا۔ خوب دل کھول کر
نہاتا دھوتا۔ مگر بچّے بھلا اس کا کہنا کہاں مانتے تھے
جب موقع ملتا گھر کے پانی سے نہا دھو لیا کرتے۔

چنو مل کی کھانے پینے کے معاملے میں بھی
یہی حالت تھی۔ آدھا پیٹ تو ہے آدھا پیٹ،
وہ کبھی چوتھائی پیٹ بھر بھی کھانا نہ کھاتا تھا۔
اس کا خیال تھا کہ انسان صرف آرام کرنے ہی سے
موٹا تازہ اور تندرست رہ سکتا ہے۔ وہ حکیموں کا
حوالہ دیتا کہ پیٹ بھر کر کھانے سے آدمی مختلف
بیماریوں کا شکار ہوکر کمزور ہو جاتا ہے کیونکہ اس
سے جسم کی مشینری کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔

اس قدر کنجوسی کے باوجود اسے سکون اور اطمینان
میسّر نہ تھا اور وہ اپنے آپ کو بے حد فضول خرچ
سمجھتا تھا۔ اس خیال سے اکثر فکر مند رہتا تھا۔ فطرتاً

کاہل ہونے کی وجہ سے وہ کام کاج بھی بہت کم کرتا تھا۔ کبھی کبھار کام کرنے چلا جاتا، ورنہ دن بھر پڑے چارپائیاں توڑا کرتا اور اپنے خیال کے مطابق آرام کے ذریعے ہی سے اپنی صحت بنایا کرتا تھا۔

ایک بار اس شہر میں کنجوسی کی ایک نامی گرامی ہستی تشریف لے آئی۔ بلاشبہ، انہیں کنجوسوں کا شہنشاہ کہا جا سکتا تھا۔ ویسے وہ اپنے آپ کو کفایت شعار ہی سمجھتے تھے۔ شہر کا ہر کنجوس ان کے پاس کنجوسی کی نئی نئی ترکیبیں معلوم کرنے آتا تھا۔ چنّو َمل کے کانوں تک بھی ان کے آنے کی خوش خبری پہنچی۔ وہ بھلا اس سنہری موقع کو کب چھوڑنے والا تھا۔ بھاگا بھاگا ان کے درشن (دیدار) کے لئے جا پہنچا تاکہ ان سے کچھ ایسی ترکیبیں اور معلوم ہو جائیں جن سے اس کے اخراجات میں اور کمی آ جائے اور اس سے اسے آرام کرنے کا موقع بھی خوب ملے۔

چنّو َمل نے ان کے پاس پہنچتے ہی بڑی لجاحت

سے ، ہاتھ جوڑ کر انہیں نمستے کہا ۔ اس مہاتما نے آنکھیں کھولیں اسے اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھا اور پھر بڑی بھاری آواز میں بولے :

"کیوں بیٹا ، کیسے آنا ہوا ؟"

چنتو مل گھگیاتے ہوتے بولے :

" سادھو مہاراج ، میں آپ کی بڑی تعریفیں سُن کر آپ کے پاس آیا ہوں ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ سے کچھ اچھی اور کام کی باتیں سیکھوں ۔ اتنی مہنگائی کے زمانے میں یہ باتیں میرے بڑے کام آئیں گی ۔ میں تو اپنے بڑھتے ہوئے اخراجات سے تنگ آگیا ہوں ۔"

سادھو مہاراج لمبے لمبے سانس کھینچتے رہے ، پھر کچھ دیر خاموش رہ کر بولے :

"اچھا بیٹا ، کچھ اپنے کھانے پینے کے بارے میں بتاؤ ۔ کیا کھاتے پیتے ہو ؟" چنتو مل نے جواب دیا :
"کھانے پینے کا آپ کیا پوچھتے ہیں ۔ دو

پیسے فی کس کے حساب سے دال چاول لے آتا ہوں۔ کھچڑی پکتی ہے، اس میں بہت سا پانی ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں چاول اور دال کا تو کہیں پتہ تک نہیں چلتا۔ بس اسی کھچڑی کو ہم پی لیتے ہیں، وہ بھی تھوڑا سا پیٹ بھرنے کے لئے۔"

مہاراج کی تیوری چڑھ گئی۔ وہ بولے :

"بھئی، تم تو بڑے فضول خرچ ہو۔ بھلا کوئی اتنا خرچیلا بھی ہوا ہے جہاں میں، جتنے تم ہو۔ رام۔ رام، ایسی فضول خرچی بھی کیا؟"

چتو مل کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

مہاراج بولے :

"مجھے دیکھو۔ خرید کر تو آج تک کچھ کھایا پیا ہی نہیں۔ دو آنے لے کر بازار گیا۔ ایک آنے کے چاول لیئے اور ایک آنے کی دال خریدی۔ دوکان سے تھوڑی دور آیا اور ذرا سی دال اور تھوڑے سے چاول الگ کر لئے اور پھر لوٹا آیا کہ بھیا یہ ہمیں

نہیں چاہئیں۔ آٹھ دس دو کانوں پر، اسی طرح کرنے سے، دو وقت کے کھانے کا انتظام خوب مزے میں ہو جاتا ہے۔ ارے ہاں، یہ تو بتاؤ کیا تمہیں کھچڑی میں گھی ڈال کر کھانے کا بھی شوق ہے؟"

"ہاں جی، ہے تو سہی۔ مگر صرف دو آنے کا ڈالڈا گھی لے آتا ہوں اور کھینچ تان کر مہینے بھر چلا لیتا ہوں۔"

"بھئی، تم نے تو حد کر دی۔ کیا کہا، دو آنے کا ڈالڈا لاتے ہو۔ بس بس، کیا یہاں گھی کی کوئی منڈی نہیں ہے۔؟ ہم تو ایسا کرتے ہیں کہ اپنی پلیٹ میں کھچڑی نکال کر، منڈی کی طرف منہ کر بیٹھتے ہیں۔ بس جی بھر جاتا ہے۔ ڈالڈا تو یوں بھی نقصان دیتا ہے۔ ہم تو گھی کا مزہ لیتے ہیں۔ اصلی گھی میں بسی ہوئی ہوا سونگھنے کا خیال لاتے ہیں اور کھچڑی کھاتے رہتے ہیں۔ اس طرح گھی کا لطف بھی اٹھایا اور تندرست کے تندرست بھی رہے۔" کنجوسوں کے شہنشاہ نے کہا۔ پھر چنو مل کو مخاطب کر کے پوچھا:

"ارے ہاں، اگر کبھی بیمار ویمار پڑ جاتے ہو تو کیا کرتے ہو؟" چنّو مل سہم کر بولے:

"مہاراج! دو چار پیسوں کی جڑی بوٹیاں لے آتا ہوں اور پھر بس......"

"واہ رے بھیّا! اسی فضول خرچی کی وجہ سے تو دنیا میں آج مصیبت آ رہی ہے۔ چاروں طرف ہائے ہائے مچی ہوئی ہے کہ کیا کریں، کیا نہ کریں۔ تم بھی نرے بدھّو ہو۔ بھلا اس ترقی کے زمانے میں بھی، کوئی جڑی بوٹیوں سے علاج کرتا ہے؟ جانتے نہیں ہو کہ آج دنیا کہاں سے کہاں پہنچ چکی ہے۔ ایسی ایسی دوائیں بن گئی ہیں کہ مرض، منٹوں چٹکیوں میں ہوا ہو جاتا ہے۔"

"مگر مہاراج! انہیں خریدنے کے لئے تو پیسے چاہئیں، پیسے!" چنّو مل تنک کر بولے۔

"واہ بھئی، واہ! اسی کو تو عقل کا پھیر کہتے ہیں۔

دواؤں کے لیئے، بھلا تم خود ہی سوچو، پیسوں کی کیا ضرورت۔ ارے بھئی کسی وقت ہسپتال چلے جاؤ۔ جس مریض کے ہاتھ میں دوا بھری شیشی دیکھو، اس سے پوچھو کہ اسے کیا مرض ہے۔ پھر جس مریض کا مرض تمہارے جیسا ہو، بس سمجھ لو کہ کام بن گیا۔ فوراً اس کی شیشی کو گندہ بتاؤ۔ تھوڑا بہت لکچر اسے پلاؤ۔ اور پھر اسی شیشی کو دھونے کے بہانے لے جاؤ۔ یہ خدمت کی خدمت رہی۔ اور فائدہ بھی ہو جائے گا۔ تھوڑا سا پانی شیشی میں ڈال کر ہلاؤ اور پی جاؤ۔ دوا کا کچھ نہ کچھ اثر تو شیشی میں رہتا ہی ہے۔ دو چار روز اسی طرح کرو۔ بس تمہاری بیماری رفوچکر ہو جائے گی۔ کم سے کم ان جڑی بوٹیوں سے تو، کہیں زیادہ مفید علاج ہے اور وہ بھی مفت۔"

ان آزمودہ اور مفید نسخوں کے بارے میں باتیں سُن کر چنو مل کی باچھیں کھل گئیں۔ مہاراج کا شکریہ

ادا کر کے اور ان کی تمام نصیحتوں کو گانٹھ میں باندھ کر وہ خوشی خوشی گھر لوٹے۔ انہوں نے مہاراج کی ایک ایک بات پر اسی دن سے عمل کرنا شروع کر دیا۔

ایک تو یہ کہ وہ پہلے ہی سے سوکھی لکڑی سے تھے۔ اب ان ترکیبوں سے اور بھی زیادہ کمزور ہوتے چلے گئے۔ اس کمزوری نے کچھ ہی دنوں میں اپنا رنگ دکھایا اور وہ اس قدر سخت بیمار پڑے کہ ان کے بچنے کی بھی آس نہ رہی۔ ان کے لاکھ منع کرنے پر بھی ان کی بیوی اپنے میکے سے کچھ روپے ادھار لے آئی اور ان کا علاج شروع کر دیا۔ علاج معالجے سے جب ان کی حالت کچھ سدھری تو ایک دن باتوں باتوں میں ڈاکٹر صاحب نے ان سے کھانے وغیرہ کے سلسلے میں پوچھ لیا۔ چنّو مل نے شرماتے ہوئے سب کچھ بتا دیا۔

ڈاکٹر صاحب بولے:

"چنوّمل، آپ بھی غضب کرتے ہیں۔ مجھے تعجّب ہے کہ اب تک آپ زندہ کیسے رہے۔ بھئی، آدمی کو زیادہ سے زیادہ کام کرنا چاہیئے۔ زیادہ کام کرنے سے وقت بھی ہنسی خوشی گزرتا ہے اور پیسے بھی زیادہ ملتے ہیں۔ اچھا کھانا اور اچھی طرح محنت کرنا ہی اچھی صحت کی کُنجی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ صفائی کا خیال رکھنا بھی بے حد ضروری ہے۔ روزانہ نہانا چاہیئے اور ہمیشہ صاف ستھرا لباس پہننا چاہیئے۔ آپ کا یہ خیال قطعی غلط ہے کہ صرف آرام سے صحت بنتی ہے۔ نہیں بھئی، زیادہ آرام طلبی تو سستی اور کاہلی کی نشانی ہے۔ محنت، صفائی، اچھا کھانا اور مناسب آرام سے کوئی بیماری پاس نہیں پھٹکتی۔"

ڈاکٹر کی نصیحت کے بعد جیسے ہی چنوّمل کی طبیعت ٹھیک ہوئی اس نے اپنی زندگی بالکل بدل ڈالی۔ اس نے اپنی پہلی باتیں چھوڑ دیں اور ڈاکٹر

صاحب کی بتائی ہوئی باتوں پر عمل کرنے لگا۔
جس سے اس گھر میں ایک انقلاب آگیا۔ وہ
سب صاف ستھرے رہنے لگے۔ اچھا کھاتے پیتے
اور بہتر علاج معالجہ کرتے ۔ اس طرح تھوڑے
ہی دنوں میں چنّو مل کے گھر میں ہنسی خوشی کا
راج ہو گیا۔

محنت کا پھل

بہت زمانہ قبل کسی گاؤں میں ایک جولاہا رہتا تھا۔ وہ اپنے ہنر میں بڑا ہوشیار تھا۔ وہ کپڑا بننے میں بہت محنت کرتا تھا۔ اس کے کپڑوں پر لاگت بھی زیادہ آتی تھی۔ اس لئے دوسرے جولاہوں کے بُنے ہوئے کپڑوں سے اس کے بُنے ہوئے کپڑے کہیں زیادہ مہنگے ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے گاؤں میں اس کے کپڑوں کی زیادہ کھپت نہ تھی۔ صرف امیر کسان اور زمیندار انہیں خرید سکتے تھے۔ اس سے اس کی آمدنی کوئی زیادہ نہ ہوتی تھی۔ اس

کے برخلاف دوسرے جولاہے اُس سے کہیں زیادہ کما لیتے تھے حالانکہ وہ بہت معمولی قسم کا کپڑا تیاّر کرتے تھے۔

ایک دن اُس نے اپنی بیوی سے کہا:

"میرا کام یہاں چلتا نظر نہیں آتا، نہ تو یہاں کے لوگ میرے ہنر کے قدر دان ہیں اور نہ ہی زیادہ پیسے والے ہیں۔ گاؤں کے دوسرے جولاہے موٹا جھوٹا کپڑا بُن کر مزے کر رہے ہیں۔ میں نے اب شہر جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو اس ملک کی راجدھانی بھی ہے۔ وہاں جاکر اپنا کام شروع کروں گا۔ بڑا شہر ہے۔ اس لئے وہاں میرا کام خوب چلے گا اور میں خوب دولت کماؤں گا۔"

بیوی نے اسے سمجھایا:

"تم ایسا نہ سوچو۔ ہماری تقدیر میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہمیں ہر جگہ ملے گا۔ اگر ہماری قسمت

میں دولت ہوئی تو وہ ہمیں یہاں بھی ملے گی۔ اگر سکھ اور آرام ہماری تقدیر میں نہیں ہے تو کہیں بھی چلے جاؤ وہ ہمیں نہیں ملے گا۔تمہارے شہر جانے نہ جانے سے ہماری تقدیر پر کچھ اثر نہیں پڑے گا۔

تم تو بے کار سی باتیں کرتی ہو۔تقدیر ہی سب کچھ نہیں ہے۔تقدیر کے ساتھ تدبیر بھی ضروری ہے۔انسان اگر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہے تو تقدیر اسے کیا دے گی ؟ محنت سے سب کچھ ملتا ہے ۔ اس کا پھل قدرت ضرور دیتی ہے۔"

"کیسی بے تکی اور فضول باتیں تم کر رہے ہو۔قسمت ہی تو سب کچھ ہے۔اگر ہماری قسمت میں سکھ لکھا ہی نہیں ہے تو محنت سے وہ ہمیں کہاں حاصل ہو جائے گا؟" بیوی نے ذرا برہم ہوتے ہوئے جواب دیا۔

ذرا سوچو! اگر ہم مان لیں کہ تقدیر ہی سب کچھ ہے تو یہ کسے معلوم ہے کہ اس کی تقدیر میں کیا ہے اور وہ کس جگہ مل سکتا ہے۔ اسی لئے تو تدبیر ضروری ہے۔ بغیر ہاتھ ہلائے تو نوالہ بھی منہ میں نہیں جاتا نانا، میں تو شہر ضرور جاؤں گا۔"

شہر جا کر اُس جولاہے نے اپنا کاروبار شروع کر دیا۔ اپنے کام میں وہ طاق تو تھا ہی، اس کے علاوہ محنت بھی خوب کرتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کچھ ہی دنوں میں اس کا کاروبار چمک اٹھا۔ ایک سے ایک نئے ڈیزائن کے کپڑے اُس نے بُننا شروع کر دیئے۔ شہر کی آبادی گاؤں کی آبادی سے بہت زیادہ تھی۔ شوقین مزاج اور پیسے والے لوگ بھی تھے۔ لہٰذا جولاہے نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی اُمید سے زیادہ روپے جمع کر لئے۔ وہ بہت خوش تھا کہ

اب اس کی محنت کا پھل مل رہا ہے۔ ایک دن بیوی کے لئے اس نے بہت سارے زیور اور بچوں کے لئے عمدہ عمدہ قسم کی چیزیں خریدیں اور اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس جولاہے نے اس سے پہلے کبھی پانی کا سفر نہیں کیا تھا۔ اب وہ دریا کے راستے اپنے گھر کو چلا۔ یہ فیصلہ اس نے اس لئے کیا کہ کشتی سے وہ اپنے گھر جلدی پہنچ جائے گا۔ کیوں کہ خشکی کا راستہ زیادہ لمبا تھا۔

اس کا سفر شروع ہو گیا۔ دور دور تک پانی ہی پانی پھیلا ہوا تھا۔ کشتی ہچکولے لیتی ہوئی دریا کے سینے پر دوڑ رہی تھی۔ جولاہے کو بڑا لطف آرہا تھا۔ تھوڑی دیر تک وہ ان نظاروں میں گم رہا اس کے بعد وہ سوچنے لگا کہ جب وہ اپنے گھر پہنچے گا تو اس کے بیوی بچے اسے دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔ جب وہ اپنی

بیوی سے یہ کہے گا کہ دیکھ میں نہ کہتا تھا کہ تدبیر اور محنت کی کنجی سے ہی تقدیر کا بند تالا کھل سکتا ہے تو اس کی بیوی کو بھی اس کا یقین آجائے گا اور وہ میرے خیال کی تائید کرے گی۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے سے اُسے ایک اور کشتی آتی ہوئی نظر آئی۔ تھوڑی ہی دیر میں دوسری کشتی نے اس کی کشتی کو آلیا۔ اس کشتی سے کچھ لوگ اس کی کشتی میں کود آئے۔ یہ دریائی ڈاکو اور لیٹرے تھے۔ انہوں نے بندوقیں دکھا کر سب لوگوں کا مال چھین لیا۔ بڑی مشکل سے جان بچا کر جولاہا اپنے گھر آیا۔ اُس کے بیوی بچے اس کی واپسی پر بے انتہا خوش ہوئے۔

بیوی نے اس کی کہانی سُن کر کہا :

"دیکھو، میں تو پہلے ہی کہتی تھی نا کہ ہماری قسمت میں دولت اور سکھ نہیں ہے۔ تم ناحق اتنی دور گئے۔ اب کبھی نہ جانا۔ تم اب یہیں رہو،

ہماری قسمت میں جو ہو گا۔ وہ ہمیں یہیں مل جائے گا۔

دورانِ سفر ساری کمائی لٹ جانے کے باوجود جولاہے کے دل پر اس کی بیوی کی باتوں کا اثر نہ ہوا۔ وہ بولا:

"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ تقدیر کے لئے تدبیر کرنا ضروری ہے۔ میں تو ایک بار پھر اپنی قسمت آزمانے ضرور جاؤں گا۔ اس دفعہ لٹ جانے کا معاملہ صرف ایک حادثہ تھا۔ دریا کا سفر ویسے بھی اکثر خطرناک ہوتا ہے۔ آئے دن ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں تھی۔ یہ میری اپنی غلطی تھی۔ بہتر تدبیر یہی تھی کہ مجھے دریا کے راستے واپس نہیں آنا چاہیئے تھا۔"

وہ اپنی بیوی کو سمجھا بجھا کر کچھ دنوں کے بعد شہر کی طرف چل پڑا۔ اس بار اس نے اور بھی زیادہ لگن اور محنت سے کام کیا اور پہلے کے مقابلے

میں دوگنی دولت جمع کی جس سے اس نے پہلے سے کہیں زیادہ تحفے تحائف خریدے اور خشکی کے راستے اپنے گھر کو روانہ ہوا۔ شہر سے چلتے وقت اسے کچھ دیر ہوگئی۔ رات نے اسے راستے ہی میں آلیا۔ اس نے سوچا رات کسی سرائے میں گذار کر صبح سویرے گھر کو روانہ ہونا چاہیئے، کیونکہ رات کے وقت لیٹروں اور ڈاکوؤں کا خطرہ تھا۔ یہ سوچ کر وہ ایک سرائے میں جا کر ٹھہر گیا۔ صبح سویرے اُس نے اپنا بکس اٹھایا گٹھری سنبھالی اور چل پڑا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اب گھر پہنچ کر اپنی بیوی سے کہے گا: "دیکھا، میں نہ کہتا تھا کہ تقدیر کے لئے تدبیر ضروری ہے۔" گھر پہنچتے ہی اسے بچوں نے گھیر لیا۔ اُس نے خوشی خوشی بکس اور گٹھری کھولی۔

مگر فوراً ہی اس نے اپنا سر ہاتھوں میں تھام قیمتی تحفے اور دولت غائب تھی۔ کچھ پھٹے پرانے چیتھڑے اور اینٹوں اور پتھروں کے ٹکڑے بکس اور

گٹھری میں بھرے ہوئے تھے۔ سرائے میں اس کے سوتے ہوئے کسی نے اس کی قیمتی چیزیں نکال لیں اور اس طرح کی ردی چیزیں بھر دیں۔ یہ دیکھ کر سب کے منہ لٹک گئے اور مسکراہٹیں غائب ہوگئیں۔

بیوی نے اسے تسلی دی: "چلو خیر ہے، صرف مال ہی گیا۔ تمہیں تو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ اب کہیں نہ جانا۔ دولت کا سکھ ہماری قسمت میں نہیں ہے۔ جو قسمت میں ہو گا۔ وہ ہمیں یہیں مل جائے گا۔ اس بھاگ دوڑ سے کیا حاصل؟"

میں دوبارہ لٹنے کے بعد بھی یہی کہوں کہ یہ محض اتفاقات ہیں ہمیں ہمت نہیں ہارنی چاہیئے۔ تقدیر بنانے کے لئے محنت اور تدبیر دونوں ضروری ہیں۔ ممکن ہے یہ میرے امتحانات ہوں۔ میں ہمت ہارنے والا نہیں ہوں۔ ویسے قسمت کا کسی کو کس طرح پتہ چل سکتا ہے۔ اگر کوئی چیز ہماری قسمت میں ہے بھی تو بغیر محنت کے کیسے ہمیں مل سکتی ہے؟ ایک اور آخری بار پھر کوشش

کر کے دیکھ لیتا ہوں۔

وہ دوسرے ہی دن پھر شہر روانہ ہو گیا۔ اب اس نے پہلے سے بھی زیادہ محنت کی اور پہلے سے کہیں زیادہ دولت جمع کر لی۔

اس نے اس دفعہ اپنی تمام دولت ایک پھٹی پرانی بوری میں رکھی اور اسے اپنے کاندھے پر لاد کر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ احتیاط کے طور پر وہ صبح سویرے شہر سے چلا تاکہ رات ہونے سے پہلے پہلے اپنے گھر پہنچ جائے۔ راستے میں کئی لوگوں نے اسے دیکھا۔ پھٹی پرانی بوری اور اس جولاہے کی خستہ حالت دیکھ کر، کسی کو ذرا بھی شبہ نہ ہوا کہ وہ بہت سی دولت لئے جا رہا ہے۔ بوری سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں لکڑی کا برادہ یا کوئی اور معمولی سی چیز ہے۔

اب اس کے گھر میں روپوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ سونے چاندی کے زیور بڑی آب وتاب

کے ساتھ جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔ اس کے بیوی اور بچے اپنے اپنے تحفے پاکر پھولے نہ سمارہے تھے۔

جولاہا فخریہ مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بکھیرے ہوئے بولا:

"دیکھا تم نے آدمی اگر محنت کرے تو کیا نہیں ہو سکتا۔ قسمت اُن لوگوں کی ہی کھلتی ہے جو محنت اور کوشش کرتے ہیں اور کسی بھی حالت میں ناکامیوں سے نہیں گھبراتے۔ میں نے دوبار اپنی ہی غلطی کی وجہ سے نقصان اٹھایا تھا۔ تقدیر کی کنجی دراصل تدبیر ہی ہے۔ تقدیر، تدبیر کے بغیر کچھ نہیں ہے۔ یہ جس نے بھی کہا ہے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ 'حرکت میں برکت ہے۔'"

اس کی بیوی کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔ وہ کچھ نہ بولی۔ بس مسکرا مسکرا کر اپنے محنتی اور سمجھدار شوہر کو دیکھتی رہی یوں لگتا تھا جیسے وہ اس کی باتوں کی اب پوری طرح قائل ہو گئی ہے۔

وقت کا فیصلہ

مغلیہ خاندان کے شہنشاہ شاہجہاں کے چار بیٹے تھے۔ ایک کا نام داراشکوہ، دوسرے کا شجاع، تیسرے کا مراد اور چوتھے کا نام محی الدین تھا۔ جو بعد میں اورنگ زیب عالمگیر کے نام سے مشہور ہوا۔

شاہجہاں جب بوڑھا ہو گیا تو اُسے فکر ہوئی کہ اس کے مرنے کے بعد تخت و تاج کا وارث کسے ہونا چاہیئے۔ داراشکوہ اپنے بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ اس لئے دستور کے مطابق تخت و تاج اور حکومت کا صحیح حقدار وہ تھا۔ یوں بھی شاہجہاں اپنے

سب لڑکوں میں اُس سے زیادہ محبّت کرتا تھا۔ دارا بہت زیادہ پڑھا لکھا اور عالم فاضل بھی تھا۔ دوسرے بیٹے بھی کسی نہ کسی اعتبار سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔

شہنشاہ اس بات کا خود فیصلہ نہ کر سکا کہ اپنا جانشین کس کو بنائے، اس نے وزیر سے پوچھا کہ اس سلسلے میں اسے کیا کرنا چاہیئے۔ وزیر نے جواب دیا۔

"حضور! مجھے چند دنوں کی مہلت دیجئے۔ یہ معاملہ بہت ہی اہم ہے۔ اس مسئلے کا تعلق نہ صرف تخت و تاج اور سلطنت سے ہے بلکہ ہندوستان کے کروڑوں عوام کی قسمت سے بھی ہے۔ حقیقی معنوں میں رعایا کا حاکم تو کوئی ایسا شخص ہونا چاہیئے جو ان کے مسائل کو بہتر طور پر سمجھے اور پھر انہیں عمدہ طریقے سے حل بھی کر سکے۔ لہٰذا اس سلسلے میں مجھے کچھ وقت عنایت فرمایئے تاکہ میں ان سب کو اچھی طرح سے پرکھ سکوں۔ اور پھر جسے سب سے

زیادہ موزوں اور مناسب سمجھوں، آپ کو بتاؤں۔"

وہ وزیر کئی دن تک اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ آخر کار اس نے چاروں شہزادوں کو جانچنے اور پرکھنے کی ایک ترکیب نکالی۔ اور اس کام کے لئے وہ چل پڑا۔ وہ سب سے پہلے داراشکوہ کے محل میں گیا۔

داراشکوہ اس وقت علمِ نجوم کی کوئی گتھی سلجھانے میں مصروف تھا۔ اُس نے اس وزیر کا استقبال کیا اور اس سے آنے کا سبب دریافت کیا، وزیر نے کہا:

"شہزادے! آپ سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا، اس لئے اچانک آ گیا ہوں۔"

پھر دونوں میں اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوگئیں۔ باتوں ہی باتوں میں مناسب موقع دیکھ کر اس وزیر نے دارا سے دریافت کیا۔

"شہزادۂ عالم! کیا آپ کو علم ہے کہ آج کل
ہمارے ملک میں چنے کا کیا بھاؤ ہے؟ دوسری بات
یہ ہے کہ کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ ہندوستان کے
کن کن شہروں میں اچھے اور عمدہ جوتے تیار ہوتے
ہیں؟ تیسرا سوال یہ ہے کہ کس شخص کو کس
سے خوشی خوشی ہار مان لینی چاہیئے۔

دارا نے ان سوالوں کو سن کر بُرا سا منہ بنایا اور
پھر اس نے کہا:

"آپ بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتے ہیں۔
بھلا شہزادوں کو ان معمولی معمولی باتوں کی طرف کہاں
دھیان ہوتا ہے۔ میں تو ایسی گھٹیا باتوں کے متعلق
کبھی سوچتا بھی نہیں۔ آپ مجھ سے سیاست، مذہب،
اخلاقیات، فلسفہ اور جنگی معاملات کے سلسلے میں کچھ
پوچھئے۔ پھر دیکھئے کہ میں آپ کو کیسی پتے کی باتیں
بتاتا ہوں۔ آپ کے ان سوالوں کا جواب تو کوئی
گھٹیا اور معمولی آدمی ہی دے سکتا ہے۔ مجھے افسوس

ہے کہ آپ نے اس قسم کے سوالات کر کے میری توہین کی ہے۔ آپ کو کم از کم شہزادوں کے مرتبے اور مقام کا تو خیال رکھنا چاہیئے۔"

وہ وزیر اپنا سا منہ لے کر وہاں سے اٹھا اور شجاع کے محل میں پہنچا۔ شجاع اس وقت رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ اُسے وزیر کا بے وقت آنا اچھا نہ لگا۔ لیکن ظاہر داری کے لئے اس نے اسے خوش آمدید کہا اور آنے کی وجہ دریافت کی۔

وزیر نے اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے شجاع سے بھی وہی تین سوال کئے۔ شجاع کو یہ سوال بڑے ناگوار گزرے۔ اس نے بڑی حقارت سے جواب دیا۔

"وزیر صاحب! آپ یہ کہاں کی بنیوں جیسی باتیں لے کر بیٹھ گئے۔ زندگی بھر میں نے صوبیداری کی ہے۔ شاہی خاندان کا چشم و چراغ ہوں۔ اگر مجھ سے

آپ کو کچھ سوال ہی پوچھنے ہیں تو انتظامی معاملات کے بارے میں کچھ پوچھیئے۔ پھر دیکھئے میں آپ کو اپنی باتوں سے کیسا قائل کرتا ہوں۔ چنوں کا بھاؤ معلوم کرنے کے لئے تو آپ کسی خادم کو ہی بازار بھیج سکتے تھے۔ آپ نے خواہ مخواہ میرا اور اپنا وقت ضائع کیا۔ اس قسم کے گھٹیا اور بازاری سوالات کر کے آپ نے میری توہین کی ہے۔ اس معاملے میں مجھے آپ سے سخت شکایت ہے۔"

وزیر وہاں سے اٹھ کر مراد کے محل میں پہنچا۔ مراد کے سامنے بھی اس نے یہی تین سوال دہرائے۔ مراد نے ان سوالات کو سن کر ایک زور دار قہقہہ لگایا، جیسے وہ وزیر کی بے وقوفی اور نادانی پر ہنس رہا ہو۔ اس نے کہا۔

"جناب! آج آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ تو اپنی دانائی اور عقل مندی کے لئے مشہور ہیں۔ قبلہ یہ تو بالکل وہی بات ہوئی جیسے کوئی کسی جوہری سے

جا کر کوئلوں کے دام دریافت کرے۔ جوہری تو جناب! ہیرے اور موتیوں کی قیمت ہی بتا سکتا ہے۔ ہم تاج و تخت پر نگاہ رکھنے والوں کو قیمت معلوم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ معاف کیجئے گا، آپ کو ان سوالات کے پوچھنے سے پہلے یہ ضرور سوچنا چاہیئے تھا کہ یہ سوالات آپ کس سے کر رہے ہیں۔ میں اس وقت صرف آپ کی عمر اور رتبے کا خیال کر رہا ہوں ورنہ ایسی بے وقوفی اور بدمذاقی کرنے کی اگر کوئی اور جسارت کرتا تو......"

اب صرف ایک شہزادہ محیّ الدین رہ گیا تھا۔ وزیر اس سے ملنے اس کے محل پہنچا۔ اس وقت شہزادہ محی الدین ملکی مسئلوں سے متعلق کچھ یاد داشتیں اور رعایا کی شکایتی عرضیاں دیکھ رہا تھا۔ اس نے وزیر کا استقبال شایانِ شان طور پر کیا اور نہایت خندہ پیشانی سے اس کے آنے کا سبب دریافت

کیا۔"

وزیر کا دل اورنگ زیب کی آؤ بھگت اور تعظیم سے بے حد خوش ہوا۔ اُس نے باتوں باتوں میں وہ تینوں سوالات اس سے بھی کر دیے۔ وہ چند لمحے خاموش رہا۔ اُس کے بعد بولا۔

"آپ نے بڑے اچھے سوالات کئے ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم ان باتوں سے واقف رہیں۔ کیونکہ یہ مسائل رعایا اور عوام کے مسائل ہیں ان سے باخبر رہنا اور پھر سوچ سمجھ کر انہیں حل کرنا، ایک اچھے اور کامیاب حاکم کے لئے لازمی ہے۔ ہمارے رسولؐ نے فرمایا ہے کہ حاکم قوم کا خادم ہوتا ہے۔ عوام اور رعایا کی خدمت ہی اس کا کام ہے۔ چیزوں کی قیمتوں کا اثر غریب عوام پر زیادہ پڑتا ہے۔ ان باتوں سے واقفیت کے بعد ہی اس سلسلے میں ہم کچھ کر سکتے ہیں۔ جہاں تک آپ کے پہلے سوال کا تعلق ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان دنوں

چنے کا بھاؤ آگرہ میں بارہ پنسیری ، دلّی میں گیارہ اور بہار میں تیرہ پنسیری ہے ۔ جہاں تک اچھے اور عمدہ جوتوں کا تعلق ہے تو یہ دلّی ، لدھیانہ اور کانپور میں بنتے ہیں ۔ کلکتّہ ، مالا بار اور کشمیر کے جوتے بھی عمدہ ہوتے ہیں ۔ آخری سوال کا جواب میرے خیال میں یہ ہو سکتا ہے کہ ایک سمجھدار اور اچھے باپ کو اپنے سب سے زیادہ اچھے اور با اخلاق و ذہین بیٹے سے بخوشی ہار مان لینی چاہیئے۔"

اس چوتھے شہزادہ سے اپنے سوالات کا جواب سُن کر وزیر بے حد خوش ہوا ۔ اُس نے اس طرح چاروں شہزادوں کی لیاقت اور قابلیت کا پورا پورا اندازہ لگا لیا ۔

جب شاہجہاں نے اس مسئلے کے بارے میں وزیر سے مشورہ طلب کیا تو اُس دانا اور تجربہ کار شخص نے جواب دیا ۔

"جہاں پناہ ! آپ کو فیصلہ کرنے کا پورا پورا حق

ہے، مگر وہ لوگ جو جاگتے ہوئے بھی سوتے
ہیں اور اپنے آس پاس کی خبر نہیں رکھتے،
وہ بھلا حکومت کی ذمّہ داریاں کس طرح پوری کر
سکتے ہیں۔ ہندوستان کے تخت و تاج کے لئے
سب سے مناسب اور موزوں شہزادہ محی الدین
ہیں۔ وہ رعایا کے معمولی سے معمولی مسئلوں پر
دھیان دیتے ہیں۔ انہیں دیکھتے، سنتے اور سمجھتے
ہیں۔ پھر ان کا مناسب حل ڈھونڈنے کی کوشش
بھی کرتے ہیں۔ لہٰذا وہی حکومت کی ذمّہ داریاں
سنبھالنے کے لئے سب سے زیادہ باصلاحیت اور
اہل ہیں"۔ وزیر کی نصیحت کے باوجود شاہجہاں نے
دارا کی محبّت سے مجبور ہو کر اپنا فیصلہ محیّ الدین
کے خلاف دیا اور داراشکوہ کو اپنا جانشین بنا دیا
مگر تاریخ گواہ ہے کہ آگے چل کر اس وزیر
کی رائے اور پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ اور شہزادہ

محی الدین اپنی طاقت، صلاحیت اور قابلیت کے بل بوتے پر اورنگ زیب عالمگیر کے نام سے کوئی نصف صدی تک برصغیر پاک و ہند پر ایک بےمثال حکمران کی حیثیت سے حکومت کرتا رہا۔

شریر لڑکا

ساجد بلا کا شریر اور نٹ کھٹ لڑکا تھا۔ دن رات نت نئی شرارتیں کرنا اس کا من پسند مشغلہ تھا۔ شرارتی ہونا تو خیر ایسی کوئی بری بات نہیں ہے، لیکن اس میں بدتمیزی بھی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اپنے گورے چٹّے رنگ، موہنی صورت، دلکش آواز اور تندرست جسم پر اُسے بڑا ناز تھا۔ وہ اپنے ہم عمروں میں سے کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ دوسروں پر بے جا رعب جمانا اسے بہت بھاتا تھا۔ اس کو مار، اس کو توڑ،

اس کے علاوہ اس کے لئے اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ اس کی شکایتیں اسکول سے برابر گھر آتیں۔ گھر پر ڈانٹ پھٹکار کے ساتھ اس کی ٹھکائی بھی ہوتی، مگر ان باتوں کا اُس پر ذرّہ برابر بھی اثر نہ ہوتا تھا۔

ان دنوں اُس کی چھیڑ چھاڑ اور مارپیٹ کا نشانہ محمود بنا ہوا تھا۔ محمود اُس کا ہم جماعت تھا۔ ایک دبلا پتلا اور نازک سا لڑکا ــــ رنگ کا کالا۔ ساجد اسے ہر وقت چھیڑتا رہتا اور ستایا کرتا۔ کبھی اسے کالا کلوٹا کہتا۔ کبھی کالا بھجنگ اور کبھی کبھار یہ تان چھیڑ دیتا:

"کالا کلوٹا۔ بینگن لوٹا۔ بڑے بازار میں دھم دھم کوٹا۔"

اگر تنگ آکر محمود بے چارہ ماسٹر صاحب سے ساجد کی شکایت کر دیتا تو پھر اس کا نتیجہ بھی اُسے ہی بھگتنا پڑتا تھا۔ اس وجہ سے وہ غریب ڈرا ڈرا اور سہما سہما رہتا تھا۔ اور خاموشی سے ساجد

کے ظلم و ستم کو سہتا رہتا تھا۔

آج بھی سارا دن ساجد محمود کو تنگ کرتا رہا۔ کبھی اسے نقشین کٹورا کہتا کبھی کچھ، اور کبھی کچھ۔ بچپن میں چیچک کے موذی مرض کے باعث محمود کی ایک آنکھ جاتی رہی تھی، جس کی بنا پر اکثر اُسے کانے کے خطاب سے بھی نوازا جاتا تھا۔ آج وہ بے چارہ اسکول میں تمام وقت اور آتے جاتے راستے میں بھیگی بلّی بنا رہا۔ اس کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، ساجد نے خوب اپنے دل کے ارمان نکالے۔

رات کے وقت جب ساجد کھانا کھانے کے بعد پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا تو کوشش کے باوجود اس کا ذہن کتابوں میں نہیں لگ رہا تھا۔ دن کے گذرے ہوئے تمام واقعات اس کے ذہن میں اس طرح ابھر رہے تھے جیسے سینما کے پردے پر تصویریں ابھر آتی ہیں۔ اس

کے دل میں بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ کل کس کس طریقے سے وہ محمود کو ستائے، چھیڑے اور پریشان کرے تاکہ اس کے دوسرے ساتھیوں پر بھی اس کا رعب بیٹھ جائے۔

شہر کے مغرب کی جانب ایک بہت گھنا اور خوفناک جنگل تھا۔ وہاں ایک دن ساجد اپنی ایرگن لئے ننھی منّی چڑیوں کا شکار کرتا پھر رہا تھا۔ نہ جانے کس طرح آج محمود بھی اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔ محمود دل کا بڑا نازک تھا۔ رحم کا جذبہ اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ ننھی منّی چڑیوں سے بے حد محبّت کرتا تھا۔ ساجد راستے میں اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتا رہا۔ اس نے محمود کو اپنے ہمراہ اس لئے لے لیا تھا کہ وہ اس کے شکار کا تھیلا وغیرہ پکڑے رہے اور شکار میں اس کی مدد کرے۔ شکار کرتے کرتے وہ دونوں جنگل میں کافی دور جا نکلے اور راستہ بھول گئے۔

محمود اس صورت حال سے گھبرا گیا۔ اس نے ساجد سے کہا رات سر پر آرہی ہے اور ہمیں راستہ بھی نہیں مل رہا ہے۔ اب ہم گھر کیسے پہنچیں گے؟ جیسے جیسے رات قریب تر ہو رہی تھی اس کی گھبراہٹ برابر بڑھتی جا رہی تھی۔

ساجد خود بھی اس حالت سے گھبرا رہا تھا، مگر اسے محمود کو تنگ کرنے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ بولا کوئی بات نہیں۔ میں تمہیں آج کسی بھوت یا چڑیل کے حوالے کر کے خود بھاگ کر گھر پہنچ جاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ قہقہے لگانے لگا۔ مگر جب رات ہو گئی اور اندھیرا بڑھنے لگا تو وہ بھی گھبرا گیا۔

جنگل میں گھپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ چاروں طرف ایک مہیب سناٹے کا عالم طاری تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ بھوک کے مارے بھی دونوں کا برا حال تھا۔ رہ رہ کر گیدڑوں کے بھونکنے کی آوازیں آتیں۔ کبھی کبھی اُلو کے بولنے کی آواز بھی سنائی

دیتی۔ وہ بہت پریشان ہوئے کہ اس عالم میں جنگل میں رات گزارنا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ وہ سہمے ہوئے چل رہے تھے کہ نہ جانے کس طرف سے کوئی جنگلی جانور آ نکلے اور انہیں پھاڑ کر چٹ کر جائے۔ جنگل میں ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ اور اس خاموشی میں اگر کوئی پتا ہلتا یا کسی جنگلی جانور کے بولنے کی آواز دور سے بھی آتی تو دونوں سر سے پاؤں تک کانپ اُٹھتے۔ تین چار گھنٹوں کی دوڑ دھوپ کے بعد آخر انہیں ایک طرف کچھ روشنی نظر آئی۔ اس روشنی میں ہلتے ہوئے کچھ سائے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اب دونوں کی ہمت بندھی اور وہ اس جانب بڑھنے لگے۔ جب وہ اس روشنی کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ وہاں بہت سے جنگلی انسان جمع تھے۔ میدان کے بیچ میں ایک بڑا سا بت رکھا تھا، جو ان کے کسی دیوتا کا تھا۔ بت کے سامنے آگ

کا ایک بڑا سا الاؤ جل رہا تھا۔ آگ کے شعلے بھڑک رہے تھے اور یہ جنگلی لوگ بت کے سامنے جھکے ہوئے رو رہے تھے اور گڑگڑا رہے تھے۔

محمود اور ساجد بڑی حیرت سے بت بنے قریب ہی چھپ کر یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ اچانک ایک جنگلی کی نظر ان پر جا پڑی۔ وہ خوشی کے مارے بے ساختہ چیخ اٹھا: "سردار، سردار! اب طوفان نہیں آئے گا۔ مصیبتوں کی بلا، ہمارے سروں پر سے ٹل جائے گی۔ دیوتا اپنا غضب اور غصہ ختم کر کے، ہم سب کو اپنی رحمت سے مالا مال کر دے گا۔" وہ جنگلی کچھ اس انداز سے چیخے جا رہا تھا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔

"کیسے؟ کس طرح؟" سردار نے پوچھا چونکہ وہ سب سے آگے تھا۔ اس لئے اس کی نظر ساجد اور محمود پر نہیں پڑی تھی۔

وہ جنگلی جس نے انہیں دیکھ لیا تھا، بولا:
"سردار، دیوتا نے ہم پر مہربانی کی ہے۔ اس نے دو انسانوں کو قربانی کے لئے خود ہمارے پاس بھیج دیا ہے۔"

یہ سن کر تمام جنگلی اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی طرف دوڑے۔ انہوں نے دونوں لڑکوں کو گھیرے میں لے لیا۔ اور ان کے گرد خوشی سے ناچنے لگے۔

اس طرح مصیبت میں خود کو گھرا پاکر محمود اور ساجد کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ موت انہیں اپنے سامنے کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

جنگلیوں کے تھرکتے ہوئے پاؤں آہستہ آہستہ رکنے لگے اور رقص ختم ہو گیا۔ دو جنگلی ان کی طرف آگے بڑھے اور محمود اور ساجد کو ہاتھوں سے پکڑ کر بت کے سامنے جلتی ہوئی آگ کے شعلوں کے پاس کھڑا کر دیا۔

سردار بولا : "بھائیو! ہر سال ہم اپنے دیوتا کو کسی انسان کی قربانی پیش کیا کرتے ہیں - اور پھر سارا سال دیوتا کی مہربانیاں ہم پر رہتی ہیں - اس سال اس مقدس قربانی کے لئے کوئی انسان نہ مل سکا تھا - شاید اسی وجہ سے دیوتا نے غصے میں آکر آندھی اور طوفان کی مصیبت ہم پر بھیجی تھی - مگر اب ہمارے دیوتا کو ہم پر رحم آگیا ہے - اس نے خود ہی دو انسانوں کو ہمارے پاس بھیج دیا ہے - آؤ اب ہم ان دونوں میں سے کسی ایک کو قربانی کے لئے چن لیں کیونکہ ہمیں قربانی صرف ایک انسان کی کرنی ہے -"

محمود اور ساجد خوف سے تھر تھر کانپ رہے تھے اور ساتھ ساتھ وہ بری طرح رو رہے تھے - گڑگڑا رہے تھے - وہ چیخ چیخ کر رحم کی درخواست کر رہے تھے مگر جنگلیوں نے ان کی ایک نہ سنی -

جنگلیوں کے سردار نے ساجد کو قربانی کے لئے
پسند کرتے ہوئے کہا :

"میرے ساتھیو ! یہ لڑکا قربانی کے لئے زیادہ
موزوں اور مناسب ہے۔ یہ دوسرا لڑکا کمزور، بیمار
اور بدصورت ہے۔ اس کی نذر سے ہمارا دیوتا خوش
نہیں ہوگا۔ لہٰذا اس دوسرے لڑکے کو ہمیں چھوڑ
دینا چاہیے۔"

سردار نے محمود کو چھوڑ دیا۔ اور ساجد کو جلتی ہوئی
آگ کے بالکل سامنے لاکھڑا کیا۔

ساجد کی حالت دیکھ کر محمود بری طرح رو رہا
تھا۔ وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا،

" اسے چھوڑ دو۔ مجھے اس کی جگہ قربان کر دو۔
خدا کے لئے اسے قربان نہ کرو۔"

ساجد بڑی حیرت سے محمود کو دیکھ رہا تھا۔
اس نے دل میں سوچا، اُف ! محمود میرے لئے
کس قدر بے چین ہے اور میں تھا کہ اسے ہر

وقت پریشان کیا کرتا تھا۔ وہ تو میری جگہ خود
مرنے تک کے لئے تیار ہے۔

قربانی کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ محمود برابر یہ
کوشش کر رہا تھا کہ وہ کسی طرح ساجد کی جگہ پہنچ
جائے اور خود مرکر اسے بچا لے۔ جنگلی جلاد جس
کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی قریب کھڑا دیکھ کر،
محمود کے حواس گم ہو گئے اور وہ پھٹی پھٹی نظروں
سے کبھی جلّاد کو اور کبھی ان وحشیوں کے مجمع کو
دیکھتا تھا۔ مگر رحم کے آثار اسے کہیں دکھائی نہ
دے رہے تھے۔ جلّاد ننگی تلوار لے کر آگے بڑھا۔
قربانی کے منتر شروع ہو چکے تھے۔ محمود کی آہ و بکا
اور ساجد کی چیخیں فضا کو نہایت ڈراؤنا اور
بھیانک بنا رہی تھیں۔ منتر پڑھنے کی آواز تیز
ہو گئی اور جلّاد کی تلوار اوپر کو اٹھی۔

"نہیں، نہیں۔ بچاؤ، بچاؤ۔ میں مرا۔ امّی، امّی!
ابّا، ابّا! ساجد زور سے چیخ رہا تھا۔

"کیا ہے ؟ کیا ہے ، ساجد ؟ اٹھو ! کیا خواب دیکھ رہے ہو ؟" اس کی امی اُسے آوازیں دے کر اٹھا رہی تھیں۔

ساجد آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس کے چہرے کا رنگ زرد تھا وہ کافی سہما ہوا تھا۔ اب اس کے سامنے نہ وہ جنگل تھا اور نہ وہ انسان نما جنگلی اور وحشی درندے۔ وہ تو اپنے گھر میں ، اپنے بستر پر پڑا ہوا تھا۔

اس کی امی نے پوچھا : " بیٹا ! کیا ، کیا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے تھے ؟ اُٹھو۔ اسکول کا وقت ہو رہا ہے۔"

اُس دن ساجد اسکول گیا تو وہ پہلے جیسا ساجد نہ تھا۔ اب وہ ایک شریف اور نیک لڑکا بن گیا تھا۔

اس دن کے بعد سے اسے محمود یا کسی اور لڑکے کو چھیڑتے ، تنگ کرتے یا ستاتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔

ہیرا اور پتھر

برسوں پرانی بات ہے کسی ملک پر ایک راجہ حکومت کرتا تھا۔ راجہ کی راجاؤں جیسی باتیں تھیں۔ سیر و شکار، تفریح اور عیش و آرام —— ایک دن وہ اپنے وزیروں اور امیروں کے ساتھ شکار کے لیے جنگل میں گیا۔ اچھا خاصا لاؤ لشکر اس کے ساتھ تھا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ سورج پوری آب و تاب سے ان کے سروں پر چمک رہا تھا۔ زمین بری طرح تپ رہی تھی۔ لُو کے جھکّڑ جسموں کو جھلسائے دے رہے تھے۔

راجہ کو شکار کھیلتے کھیلتے سخت پیاس لگی۔ ان کے پاس پانی کا ذخیرہ بالکل ختم ہو چکا تھا۔نوکرچاکر پانی کی تلاش میں چاروں طرف نکل پڑے۔ مگر آس پاس نہ کوئی کنواں تھا اور نہ ہی کوئی چشمہ یا تالاب۔ پیاس کے مارے راجا کا گلا خشک ہو گیا، زبان میں کانٹے پڑ گئے، مگر پانی کہیں نہیں ملا۔

آخر راجہ نے مجبور ہو کر حکم دیا کہ اگر پانی نہیں ملتا تو کہیں سے کوئی رس دار پھل ہی لے آؤ تاکہ اس کا رس چوس کر پیاس بجھائی جا سکے بہت تلاش کے بعد نوکروں کو انار کے کچھ درخت نظر آئے۔ انہوں نے سوچا اس وقت اس سے بہتر اور کون سا پھل ہو سکتا ہے۔ چلو کچھ انار توڑ کر راجہ کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں۔

یہ جنگلی انار کافی اونچائی پر لگے ہوتے تھے اس لئے راجہ کے آدمی پتھر مار کر انار توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اتنے میں راجہ بھی وہاں

پہنچ گیا۔ جب راجا کے نوکر انار توڑنے کے لیے پھر پتھّر مارنے لگے تو ایک زوردار قہقہہ سنائی دیا۔ انہیں ایسا معلوم ہوا جیسے وہ لوگ کوئی بے وقوفی کر رہے ہوں اور ان کی اس حماقت پر کوئی دل کھول کر ہنس رہا ہو۔

راجہ نے غور سے اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے کچھ فاصلے پر ایک اندھا بوڑھا نظر آیا جو بری طرح ہنس رہا تھا۔ راجا کو اس پر سخت غصّہ آیا۔ اُس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس بے ادب بوڑھے کو وہ لوگ فوراً گرفتار کر کے اُس کے سامنے پیش کریں۔ راجہ نے غصّہ میں پاگل ہوتے ہوئے کہا: "اس نے اس طرح ہنس کر ہماری شان میں گستاخی کی ہے۔"

حکم کی دیر تھی کہ بوڑھے کو گرفتار کر کے راجا کے حضور میں پیش کر دیا گیا۔ راجا نے بڑے غصّے سے اندھے بوڑھے سے ہنسنے کا سبب

دریافت کیا۔

بوڑھا بڑی بے باکی سے بولا:

"حضور! میں آپ کے نوکروں کی بے وقوفی پر ہنس رہا تھا۔ بھلا بتایئے، جنگل میں اچھے انار اس موسم میں کہاں مل سکتے ہیں۔ اُن اناروں کو طوطوں اور گلہریوں نے کہاں چھوڑا ہو گا۔ جو انار آپ کو نظر آ رہے ہیں وہ سوکھے اور گلے سڑے ہیں۔ انہیں پرندوں نے کھا کر چھوڑ دیا ہے۔ پیاس سے آپ کا بُرا حال ہے۔ یہ لوگ اگر عقلمند ہوتے تو آپ کو راجدھانی واپس لوٹ جانے کا مشورہ دیتے یا آس پاس کے کسی گاؤں میں جا کر آپ کے لئے پانی ڈھونڈھ لاتے۔ آپ خود سوچئے کیا یہ بے وقوفی کی بات نہیں؟ بھلا ان کی اس حماقت پر کسے ہنسی نہ آئے گی؟"

راجہ کو بوڑھے کی بات اچھی لگی۔ بات تھی بھی بڑے پتے کی۔ راجہ بوڑھے کو اپنے ساتھ

محل لے گیا اور حکم دیا کہ اسے روزانہ ایک سیر مکئی مفت دی جائے۔ راجہ جب بھی کسی پریشانی یا الجھن میں گرفتار ہوتا تو فوراً بوڑھے کو طلب کرتا اور اس سے مشورہ کرتا۔ بوڑھا اپنے تجربے اور سمجھ بوجھ کے بل پر اس کی پریشانی اور الجھن کو دور کر دیتا۔

ایک دن راجہ کے دربار میں ایک جوہری آیا۔ اس نے راجہ کو دو قیمتی پتھر پیش کیے جو اپنی چمک دمک اور خوبصورتی میں بے مثال تھے۔ دونوں کی تراش خراش، وزن اور سائز بالکل ایک جیسا تھا۔ جوہری نے راجہ سے کہا:

"حضور! ان میں سے ایک نہایت قیمتی ہیرا ہے اور دوسرا پتھر۔ اب ہیرے کی شناخت آپ پر ہے۔ آپ خود اصل ہیرے اور پتھر کو پہچانیں۔"

راجہ اور اس کے درباری اصل ہیرے کو پہچاننے میں ناکام رہے تو راجا نے اس بوڑھے کو

بلوایا اور اس سے کہا کہ اصل ہیرے کو شناخت کرے۔ بوڑھے نے تھوڑی دیر تک غور کرنے کے بعد ان میں سے ایک کو اٹھاکر راجہ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا:

"حضور! یہ رہا اصلی ہیرا۔ اسے آپ بے فکر ہو کر خرید لیں۔"

جوہری اندھے کی صحیح پہچان پر حیران رہ گیا۔ اس نے کہا:

"مہاراج! اس نابینا شخص کا انتخاب بالکل صحیح ہے۔"

راجہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ آنکھوں والے جس چیز کو نہ پہچان سکے، اسے ایک اندھے نے کس طرح اتنی جلدی اور آسانی سے پہچان لیا۔ اس نے اس اندھے سے پوچھا:

"بڑے میاں! تم دیکھنے سے معذور ہو، اس کے باوجود تم نے کس طرح اتنی آسانی سے

اصل ہیرے کو پہچان لیا ؟"

بوڑھا مسکرا کر بولا :

" حضور، یہ کون سی ایسی بڑی بات ہے۔ پتھر گرمی پا کر گرم ہو جاتا ہے، مگر ہیرے پر گرمی کا اثر نہیں ہوتا۔ میں نے ان دونوں کو کچھ دیر دھوپ میں رکھ کر یہ پہچان لیا کہ ہیرا کون سا ہے۔"

راجہ بوڑھے کی عقل مندی سے بے حد خوش ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ آج سے بوڑھے کو بجائے ایک سیر کے دو سیر مکئی ہر روز دی جائے۔

کچھ دنوں کے بعد راجہ نے پھر بوڑھے کو بلایا اور کہا :

" بڑے میاں ! تم بہت عقل مند، سمجھدار اور دانا ہو۔ میری ایک بات کا ٹھیک ٹھیک جواب دو کہ میں ایک عقل مند، نیک اور خاندانی راجہ ہوں یا کہ نہیں ؟"

بوڑھا چند لمحے سوچنے کے بعد بولا :

"نہیں۔ بالکل نہیں!"

بوڑھے کی اس گستاخی اور جرأت پر تمام درباری سکتے میں آگئے۔ جیسے انہیں سانپ سونگھ گیا ہو۔

راجہ غصّے سے آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے پوچھا:
"تم نے یہ اندازہ کس طرح لگایا؟"

بوڑھا بولا:

"حضور! آپ خاندانی راجہ نہیں ہیں۔ آپ ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے۔ ترقی کرتے کرتے فوج کے سپہ سالار ہو گئے۔ غریب ہونا کوئی بُری بات نہیں اور نہ ترقی کرنا کوئی بری بات ہے مگر آپ نے یہ کام اچھا نہیں کیا کہ اصلی راجہ یعنی اپنے محسن کو دھوکے سے قتل کر کے اس کے تخت و تاج پر قبضہ کر لیا۔ احسان فراموشی بہت بری بات ہے اور سب سے بڑا گناہ۔ آپ نے اپنے محسن سے دغا بازی کی، اس لئے آپ

نیک آدمی نہیں ہیں۔ آپ سمجھ دار اور عقل مند بھی نہیں ہیں کیونکہ آپ کو کھرے اور کھوٹے کی پہچان نہیں۔ آپ نے میری قابلیت، اہلیت اور تجربے تک کی قدر نہ کی۔ آپ نے میری دانائی اور عقل مندی کا انعام صرف چند سیر مکئی کے دانوں سے دیا۔ میرا انعام تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ آپ مجھے اپنے خاص درباریوں میں شامل کرتے اور ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے تاکہ آپ میرے مشوروں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے۔ آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ جو شخص کسی آدمی کی عقل مندی اور دانائی سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھائے وہ کس طرح عقل مند اور دانا کہلا سکتا ہے۔

راجہ کی گردن شرم اور ندامت سے جھک گئی۔ درباریوں میں سے کسی کی ہمت نہ تھی کہ بوڑھے کی بات کا جواب دیتا اسکے بعد بوڑھا بڑے اطمینان سے اٹھا اور رخصت ہو گیا۔
